۷۸۶

سلسلۂ مطبوعات مجلس
۱۵۲

تحفۂ کشمیر

یعنی

ان تقاریر و خطابات کا مجموعہ جو ۲۹ ؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء اور ۴ ؍ نومبر ۱۹۸۱ء کے
درمیان سری نگر کشمیر کے مختلف اجتماعات اور تقریبات کے موقعوں پر کئے گئے

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

بار اوّل

۱۴۰۲ھ ــــ ۱۹۸۲ء

کتابت ــــــــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــــــــ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس (آفسٹ)

صفحات ــــــــــــــــ ۱۰۴

قیمت اردو ایڈیشن ــــــــــــــــ آٹھ روپے

انگریزی ایڈیشن۔ نیز کشمیری زبان میں ــــــــــــــــ زیر طبع

تصویر سرورق: ــــــــــــــــ جامع مسجد۔ سری نگر کشمیر

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

فہرست عناوین

"تحفۂ کشمیر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝
(الذٰریٰت۔ ۵۵)

(اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو)

پیش لفظ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

بچپن سے عربی کا ایک حکیمانہ مقولہ کانوں میں پڑا ہوا ہے "کل أمر مرھون بوقتہ" ہر کام اپنے وقت کے ساتھ اس طرح مربوط و مشروط ہے جیسے رہن رکھا ہوا سامان، اس مقولہ کی حکمت وصداقت کا تجربہ جیسا کشمیر کے سفر کے بارے میں ہوا، یاد نہیں آتا کہ کسی اور مسئلہ میں ہوا ہو، راقم سطور ۱۹۴۵ء میں پہلی مرتبہ کشمیر گیا تھا، اس سفر کا بڑا حصہ پونچھ کے علاقہ میں گذرا، رمضان کا چاند ہو گیا تھا کہ سری نگر پہونچنا ہوا، سری نگر اور اس کے اطراف میں ہفتہ عشرہ سے زیادہ قیام نہیں ہو سکا، اس کے بعد جہاں جہاں کے سفر پیش آئے (جن میں بعض بہت دور دراز کے ممالک اور شہر تھے) وہاں بار بار جانا ہوا، اس وقت تک یورپ کے چار سفر ہو چکے ہیں، جن میں اس کے بیشتر اہم ممالک شامل ہیں، ایک ایک بار امریکہ، مغرب اقصیٰ، مراکش، اسپین، افغانستان اور ایران بھی جانا ہوا، باقی مشرق وسطیٰ کے اہم عرب ممالک اور ترکی متعدد بار جانا ہوا، لیکن باوجود قوی اور معقول محرکات، قابل لحاظ دواعی اور تقاضوں کے ۱۹۴۵ء سے لے کر، اکتوبر ۱۹۸۱ء تک دوبارہ کشمیر کے سفر کی نوبت نہیں آئی، کئی بار سفر کی مختلف تقریبات اور مناسب و موزوں مواقع پیش آئے، لیکن ہر بار سفر ٹل ٹل گیا، ایک بار ہوائی جہاز میں سیٹیں بھی مخصوص ہو گئیں، اور ٹکٹ بھی لے لئے گئے،

پھر عین موقعہ پر کوئی قوی مانع پیش آگیا، یوپی کی جھلسا دینے والی گرمی سے پناہ حاصل کرنے اور کہیں معقول اور خوشگوار موسم اور پُرسکون جگہ میں تحریری و تصنیفی کام کرنے کا شدت سے تقاضہ پیدا ہوا، اور ضرورت محسوس ہوئی لیکن اس کے لئے بھی بمبئی، لوناولہ اور بنگلور کا انتخاب ہوا، مگر کشمیر (جس کو جنت نظیر کہتے ہیں) کے سفر کی نوبت نہیں آئی۔

جولائی، اگست ۱۹۸۱ء..... محترمی پروفیسر آل احمد صاحب سرور نے جو اب کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں، کئی بار کشمیر آنے کی باصرار دعوت دی، اکتوبر ۱۹۸۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں وہاں پندرھویں صدی ہجری کی تقریب سے ایک سیمنار "اسلام عصر جدید میں، اس کے مسائل و امکانات" کے عنوان سے منعقد ہو رہا تھا، ان کی خواہش تھی کہ میں اس کا افتتاح کروں، ان کی دعوت ایسے مخلصانہ اور محبانہ طریقہ پر تھی کہ میرے لئے اس کا نظر انداز کرنا آسان نہ تھا، لیکن ستمبر کے پہلے ہی ہفتہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، اور رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے اہم جلسوں میں شرکت کے لئے حجاز کا سفر پیش آگیا، ان جلسوں کے اختتام کے عین بعد حج کا زمانہ شروع ہو رہا تھا، اور اس ملتی ہوئی دولت کو چھوڑ کر آنا مشکل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶ر اکتوبر کو جب میں اپنے مستقر پر لکھنؤ پہونچا، تو سیمنار ختم ہو چکا تھا، لیکن اچانک معلوم ہوا کہ کشمیر یونیورسٹی نے مجھے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے، جو ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جلسۂ تقسیم اسناد (کانووکیشن) میں دی جائے گی، اس سلسلہ میں گورنر صاحب جموں و کشمیر (بی کے نہرو صاحب) وحیدالدین ملک صاحب وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے خطوط اور تار آئے ہوئے ہیں کہ منظوری کی فوراً اطلاع دی جائے، میرے لئے یہ اعزاز، یا حادثہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا، تھوڑے سے تردد اور ذہنی کشمکش کے بعد، اور اس شرط کے ساتھ کہ اس کی نوعیت خالص

علمی اور ادبی ہو، سیاست سے اس کا دور کا تعلق بھی نہ ہو، میں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مشورے سے اس اعزاز کو قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیا، اور اس کی مذکورہ بالا حضرات کو بذریعہ تار اطلاع دے دی، میرے سامنے ـــــــ مولانا سید سلیمان ندوی، ـــــــ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ـــــــ اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی نظیر تھی، جن کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ ڈگری پیش کی تھی، اور انھوں نے قبول فرمایا تھا، ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اس موقعہ سے (جو طبقۂ علماء کے افراد، اور دین کے نمائندوں اور داعیوں کو شاذ و نادر ہی میسر آتے ہیں) جدید تعلیم کے ماہرین، یونیورسٹی کے اساتذہ و فضلاء، اور ملک کے بعض ذمہ داروں کے سامنے، علم و حاملینِ علم کے بارے میں اپنے خیالات اور مشوروں کے پیش کرنے کا موقعہ ملے گا، اور ایک داعی کی حیثیت سے مجھے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے کہ ۔ ع

غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مجھے معلوم نہیں تھا کہ یونیورسٹی کے اس اعزاز (جو بہرحال قابل قدر ہے) کا محض بہانہ ہے، حکمت الٰہی کو اپنے ایک عاجز بندہ سے کچھ اور ہی کام لینا ہے، میں ۲۸ اکتوبر کو سری نگر پہونچ گیا، کشمیر کے احباب، اسلامی انجمنوں اور تنظیمات کے سربراہوں، اور سری نگر کے اہل ذوق اور مخلص احباب کے لئے یہ ایک طرح کا انکشاف اور کسی حد تک حیرت انگیز واقعہ تھا کہ میں چھتیس ۳۶ برس کی طویل مدت کے بعد ایک معمولی سی تحریک پر کشمیر آرہا ہوں، انھوں نے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا، اور میرے سری نگر کے قیام کے نو دن تقریروں اور خطابات کے پروگرام کی وجہ سے سخت مصروفیت کے گذرے، کسی کسی دن تقریروں کے تین ۳ تین ۳ پروگرام ہوتے تھے، اہل کشمیر نے جس محبت و خلوص، پذیرائی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا،

وہ عرصہ تک یاد رہے گا، اور وہ اس "ایران صغیر" اور اسلامی خطہ کی تہذیب و روایات مہمان نوازی اور اخلاق کے عین مطابق ہے، میں خصوصی طور پر محترمی جناب وحیدالدین ملک صاحب وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کا شکرگذار ہوں، جو اس تقریب کے اصل محرک تھے، اور جنھوں نے پہلے سے مجھ سے سری نگر میں اپنے یہاں چند دن قیام کا وعدہ لے لیا تھا، میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب کا بھی خصوصی شکرگذار ہوں، جنھوں نے مختلف مجالس کا انتظام کیا، اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا آزادانہ موقعہ دیا، وزیر اعلیٰ کشمیر جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے بھی پامپور کے زعفران زار میں ایک اچھی مجلس ترتیب دی، جس سے حُسن مذاق اور حُسن اخلاق دونوں کا اظہار ہوتا تھا، میرے اس فیصلہ میں سب سے بڑا دخل، اور اس سفر میں سب سے بڑا حصہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا ہے جن کے پیہم اصرار اور مسلسل و متواتر خطوط نے میرے لئے کوئی عذر باقی نہیں رکھا، ان حضرات کے علاوہ راقم ان سب احباب اور بزرگوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے، جنھوں نے اسلامی اخلاق اور دینی اخوت کا معاملہ فرمایا اور مجھے اپنے کشمیری بھائیوں سے آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے اور اپنے خیالات و تجربات پیش کرنے کا موقعہ فراہم کیا، ان کی فہرست طویل ہے، اگر ان کے نام صفحۂ قرطاس پر نہ آسکے، تو لوح دل پر ضرور لکھے ہوئے ہیں۔

راقم نے جن اہم اسلامی ممالک کی سیاحت کی، وہاں اس نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کا لبِّ لُباب اور اپنا درد دل رکھا، عام طور پر یہ تقریریں عربی میں ہوئیں، ان کا عنوان اس خاص ملک کو خطاب کرکے "اسمعی یا مصر" "اسمعی یا سوریا" "اسمعی یا ایران" "نحن الآن فی المغرب" اور "حدیث پاکستان" وغیرہ ہے، سری نگر کے اس مختصر قیام میں جو تقریریں کی گئیں ان کا مجموعہ

"تحفۂ کشمیر" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، ان میں صرف وہ تقریریں شامل ہیں، جن کے ٹیپ راقم کو مل سکے، اور جن میں کوئی خاص پیغام، اور راقم کے نزدیک خصوصی افادیت و اہمیت تھی، قربِ مکانی، مسائل و مشکلات سے ذاتی واقفیت اور عمر و تجربہ کی پختگی کی بناء پر، ان تقریروں میں بعض ایسے حقائق و مضامین آ گئے ہیں، جو نہ صرف اہلِ کشمیر، بلکہ بیشتر اسلامی ممالک کے اہلِ فکر و نظر کے لئے لائقِ توجہ، اور مستحقِ غور و فکر ہیں، امید ہے کہ مقرر کو علامۂ اقبالؔ کے الفاظ میں اپنے دوستوں کا یہ شکوہ نہ کرنا پڑے گا، کہ ؎

دلے بر کفِ نہادم، دلبرے نیست
متاعے داشتم، غارت گرے نیست

اور نہ ان الفاظ میں فریاد کرنی پڑے گی، کہ ؎

باں راہے کہ گفتم پے نہ بردند
زشاخِ نخلِ ما خرما نہ خوردند
من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

میں اپنے عزیز و محترم رفیق (نہ صرف رفیقِ سفر بلکہ رفیقِ کار) ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ان کی درازیِ عمر و دوامِ توفیق کے لئے دعا کرتا ہوں، جن سے اس سفر میں مجھے بیش بہا مدد ملی، وہی پروگراموں کی تنظیم و ترتیب کا کام کرتے تھے، اور انھوں نے بڑی حد تک مجھے اس فکر و مشغولیت سے سبکدوش کر رکھا تھا۔

آخر میں یہ کہہ کر رخصت ہوتا ہوں ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو | عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب | عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ابوالحسن علی ندوی
دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ
رائے بریلی

۳۰ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ
۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

وادی کشمیر میں توحید خالص کا پہلا پیغام اور اس کے علمبردار

کشمیر میں اسلام تلوار سے نہیں، روحانیت سے پھیلا

[یہ تقریر یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء) کو بروز جمعہ مسجد سری نگر میں نماز جمعہ سے پیشتر ایک مجمع عظیم کے سامنے ہوئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں سری نگر اور اطراف کے مسلمان شریک تھے۔]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات أعمالنا من یھدہ اللہ فلا مُضِلّ لہ ومن یُضلِلہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد أن سیّدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم إلی یوم الدین۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ	کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ
وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ	تو اسے کتاب، حکمت اور نبوت سے سرفراز
كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰـكِنۡ	فرمائے اور اس کا شیوہ بن جائے کہ

کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ	لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے
الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ○	بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ اللہ والے
وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ	بن جاؤ، یہ اس لئے اور بھی کہ تم کتاب آسمانی
وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ءَ اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ	کے پڑھانے پڑھنے میں مشغول رہتے ہو، نہ وہ
بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○	تم کو اس کا حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو
(آل عمران - ۷۹-۸۰)	اپنا پروردگار بنا لو، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ
	تمہیں کفر کا حکم دے بعد اس کے کہ تم اسلام
	(دین توحید خالص) میں داخل ہو چکے ہو؟

بھائیو اور دوستو! جیسا کہ ابھی محترم میرواعظ مولانا محمد فاروق صاحب نے فرمایا کہ میں یہاں ۳۶ سال کے بعد آیا ہوں[1] عمر و صحت کا قافلہ جس رفتار سے جا رہا ہے، اس لحاظ سے مستقبل کے متعلق تیقّن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، سب ارادۂ الٰہی پر موقوف ہے، میں جب ۳۶ سال قبل یہاں آیا تھا، تو اس وقت میرواعظ حضرت مولانا یوسف شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے، میں ان کا مہمان تھا، ان سے میرا تعارف ہندوستان میں نئی دہلی میں نظام الدین کے تبلیغی اور ندوۃ العلماء کے تعلیمی مرکز میں ہوا تھا، جب میں نے یہاں قدم رکھا تو بے اختیار وہ دور یاد آگیا، وہ منظر یاد آیا جب وہ اسی منبر جامع مسجد سے قرآن و حدیث کے ارشادات کے موتی بکھیرتے تھے، آج ان کی صورت (تخیّل کی آنکھوں کے) سامنے ہے، میں اس بار جب آیا ہوں تو وہ اپنے مالک و خالق کے پاس پہونچ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور ہمارے موجودہ میرواعظ مولانا محمد فاروق صاحب کی زندگی اور علم و عمل میں ترقی عطا فرمائے آمین

[1] سری نگر کا پہلا سفر رمضان ۱۳۶۴ھ (اگست ۱۹۴۵ء) میں ہوا تھا۔

میرے بھائیو! جو مسافر اتنے دنوں کے بعد آیا ہو، اور اسے آئندہ آنے کی یقینی و قطعی طور پر امید بھی نہ ہو، اس کو آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کرنا چاہئے؟ ایسے موقعہ پر آدمی اپنا دل اور کلیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے، اس لئے چاہتا ہوں کہ فقیر کے پاس جو قیمتی سے قیمتی تحفہ ہے، وہ آپ کے سامنے رکھدے، اور وہ فقیر کی ملکیت نہیں، اس کے گھر کی چیز نہیں، وہ اسے اللہ کی طرف سے کلام الٰہی کے ذریعہ ملی ہے، یہ دولت سب کو وہیں سے ملی ہے، اور جس کو ملے گی قیامت تک وہیں سے ملے گی، ہدایت کا سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے، اس لئے میں آپ کے سامنے سب سے ضروری پیام، اور سب سے ضروری سبق دُہرانا چاہتا ہوں۔

ابھی میر واعظ صاحب نے چند مبارک نام لئے، ان میں ایک مبارک نام حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کا ہے ؎

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

میرا ان کے سلسلہ سے اور ان کی ذات سے ایک طرح کا خاندانی تعلق بھی ہے، وہ اس طرح کہ وہ اور میرے جدِّ امجد امیر کبیر سید قطب الدین محمد مدنیؒ ایک ہی سلسلہ کے تھے[1] اور مجھے ان سے ایک قلبی ربط محسوس ہوتا ہے، میں آپ سے پوچھتا ہوں حضرت

---

[1] امیر کبیر سید قطب الدین محمد مدنیؒ (متوفی ۶۷۷ھ) ابوالجناب حضرت نجم الدین کبریٰؒ (م ۶۱۰ھ) کے خلفاء میں سے تھے، جن کے سلسلہ میں امیر علاء الدولہ سمنانیؒ کی شاخ پر ثمر سے امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) منسلک اور وابستہ تھے، یہ سلسلہ سہروردیہ تھا، جو کشمیر میں کبروی، بہار میں فردوسی، اور دکن میں جنیدی کہلاتا ہے، حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (مخدوم بہاری) (م ۷۸۶ھ) اسی سلسلہ کے مشائخ کبار میں تھے، جن کے مکتوبات سہ صدی.... مشہور ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم)

میر سید علی ہمدانیؒ کو ختلان[1] سے کونسی چیز کھینچ کر یہاں لائی، کیا اس حسین وادی کا حُسن کھینچ کر لایا؟ کیا سلسلۂ ہمالیہ کی چوٹیوں کی بلندی اور وادیوں کی شادابی کھینچ کر لائی؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جس خطّہ سے آئے تھے، وہ بھی حسین خطّہ تھا، پھلوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا، پھر کیا چیز ہے، جو ان کو یہاں لائی؟ آپ ہر وقت ان کا نام لیتے ہیں، اللہ کا شکر ہے آج صدیاں گذرنے کے بعد بھی آپ کا ان سے تعلق قائم ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور اخلاص و روحانیت کی برکت سے ابھی یہاں اسلام محفوظ ہے۔

میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کون سی چیز تھی، جو ان کو کھینچ کر لائی؟ وہ ایک غیرت تھی، جس کو اپنے محبوب سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس کی ذات وصفات کی زیادہ معرفت ہوتی ہے، اور اس کے محاسن وکمالات پر زیادہ یقین ہوتا ہے، اس میں اتنی ہی اپنے محبوب کے بارے میں غیرت ہوتی ہے، ایک ناواقف آدمی لعل وجواہر کو اینٹ پتھر کی طرح ڈال دیتا ہے، قیمتی ہیرے کو ناواقفی سے توڑ دیتا ہے، لیکن جوہری کو دیکھئے کہ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، اور اس کی کس طرح حفاظت کرتا ہے، ایسے ہی باغبان کو دیکھئے وہ کس طرح ایک ایک پھول پر قربان ہوتا ہے، اور اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس پر کوئی شکن آئے، بلبل سے پوچھئے گل کے متعلق، پروانوں سے پوچھئے شمع کے متعلق، عاشق سے پوچھئے معشوق کے متعلق، اور خدا کے پیغمبروں، اور اس کے عارفوں سے پوچھئے توحید کے متعلق۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید کے سب سے بڑے امین، اور اس کے سب سے بڑے مبلّغ وداعی، اور اس کے عارف وحقیقت شناس تھے، صدیوں سے انہی کی لائی ہوئی دولت ہے،

---

[1] ختلان ماوراء النہر کے علاقہ میں سمرقند کے قریب شہروں کا ایک مجموعہ ہے جو دریائے جیحون کے بالائی حصہ پر واقع ہے، اس ضلع کے ایک شہر یا مقام کو ختل بھی کہتے ہیں، جمع کے موقع پر ختلان بولتے ہیں (مراصد الاطلاع، دائرہ معارف اسلامیہ وغیرہ)

جواب تک بٹ رہی ہے، اور قیامت تک بٹتی رہے گی، ہمارے اور آپ کے دامن میں بھی خدا کے فضل سے وہی دولت موجود ہے' آنحضرت (روحی فداہ) سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے سب سے زیادہ اللہ کو چاہنے والے، سب سے زیادہ اللہ پر قربان ہونے والے تھے' اس لئے آپ کی غیرت کا بھی یہ حال تھا کہ ایک شخص نے صرف یہ کہہ دیا کہ :-

من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی۔ — جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ہدایت پائے گا، اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔

آپ اس کو برداشت نہیں کر سکے، اور آپ سے سنا نہ گیا، فرمایا " بئس الخطیب انت قل ومن یعص اللہ ورسولہ "[1] (تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں (الگ الگ) یوں کہو کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، وہ گمراہ ہوگا) ایسے ہی ایک شخص نے کہا "ماشاء اللہ وشئت" (اگر اللہ اور آپ چاہیں تو یہ کام ہو جائے) آپ نے فرمایا " جعلتنی واللہ عدلاً، بل ماشاء اللہ وحدہ "[2] (تم نے مجھے خدا کا ہمسر بنا دیا؟) نہیں " ماشاء اللہ وحدہ " (جو تنہا خدا چاہے)۔

یہ ہے غیرت کا عالم، ایک عاشق صادق کو جتنی محبت ہوتی ہے' اتنی ہی غیرت ہوتی ہے' غیرت تابع ہے محبت کے، غیرت تابع ہے علم کے' غیرت تابع ہے خلوص کے' اگرچہ سوء ادبی ہے' لیکن اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی' دیکھئے میاں بیوی کا تعلق کیسا نازک ہوتا ہے' کتنا قریبی، کتنا دائمی' اور کتنا مخلصانہ ہوتا ہے' تو شوہر کی غیرت بیوی کے بارے میں' اور بیوی کی غیرت شوہر کے بارے میں کتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے' شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا

---

[1] صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۸۶ (کتاب الجمعہ) [2] مسند احمد ج ۱ ص ۲۸۳

(اگر وہ شریف ہے، مرد ہے، اور صحیح معنی میں غیرت دار ہے) کہ اس کی بیوی پر غیر کا سایہ پڑے، کسی سے تھوڑا سا بھی علاقہ ہو، کسی کی طرف اس کا میلان ظاہر ہو جائے، چونکہ حضرت امیرکبیر میر سید علی ہمدانی قدس سرّہٗ عارف باللہ تھے، ولی کامل تھے، عاشق خدا تھے، عاشق رسول تھے، خداشناس، دین کے مزاج آشنا اور نبّاض تھے، اس لئے آپ کو دین کے بارے میں غیرت بھی ایسی تھی کہ لاکھوں کروروں آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی، انھوں نے سنا کہ کشمیر ایک طویل و عریض وادی ہے، وہاں کے لوگ خدا سے ناآشنا ہیں، وہاں خدا کی ذات کے سوا، خالق کائنات کے سوا، وحدہٗ لاشریک کے سوا بہت سی چیزیں پوجی جا رہی ہیں، اصنام کی پرستش ہوتی ہے، کچھ چیزیں زمین کے اندر ہیں، کچھ زمین کے اوپر ہیں، کچھ کھڑی ہیں، کچھ لیٹی ہیں، لوگوں نے جس میں ذرا سی طاقت دیکھی، نفع و نقصان پہونچانے کی صلاحیت دیکھی، کوئی خصوصی امتیاز دیکھا، ذرا سا حُسن و جمال دیکھا، اسی کے سامنے جھک گئے، میرا خیال ہے کہ اگر وہ یہاں نہ آتے تو شاید خدا اور اس کا رسول ان کا دامنگیر نہ ہوتا، اس لئے کہ وہ جہاں رہتے تھے، وہاں سے لے کر اس وادیٔ کشمیر تک بڑے بڑے دین کے روحانی مراکز تھے، ہمالیہ کے دامن میں پورا ہندوستان پڑا ہوا تھا، جہاں ہزاروں عالم، سیکڑوں مدرسے اور خانقاہیں تھیں، لیکن عالی ہمت یہ نہیں دیکھتے کہ تنہا ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں؟ وہ اس فریضہ کو اپنا ذاتی فریضہ سمجھ لیتے ہیں، ہزار کوئی ان کو روکے، ان کے راستہ پر ہزار کوئی رکاوٹیں کھڑی کر دے، پہاڑ ان کے راستہ میں حائل ہوں، دریا سدّ راہ ہوں، وہ کسی کی بھی پروا نہیں کرتے، گویا کوئی آسمانی آواز تھی، جو انھوں نے سنی کہ سیّد! کشمیر جاؤ، اور وہاں توحید پھیلاؤ۔

سید علی ہمدانی نے صاف محسوس کیا کہ میں عنداللہ جواب دہ ہوں، میدان حشر سامنے ہے، عرش خداوندی موجود ہے، اس کے سایۂ رحمت میں انبیاء و اولیاء کھڑے ہیں، اور وہاں سے

سوال ہوتا ہے کہ سید علی ؒ اتم کو علم تھا کہ میری پیدا کی ہوئی زمین کے ایک خطہ میں غیر اللہ کی پرستش ہو رہی ہے، غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز کئے جا رہے ہیں، دامن مراد پھیلائے جارہے ہیں تم نے اس کو کیسے برداشت کیا؟ میر سید علی ہمدانی کے سامنے تو یہ منظر تھا، اگر ساری دنیا کے علماء و حکماء جمع ہو کر سمجھاتے کہ حضرت! آپ سے سوال نہیں ہوگا، لیکن وہ کہتے کہ نہیں مجھ ہی سے یہ سوال ہوگا، میری غیرت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اللہ کی لمبی چوڑی زمین کے ایک چھوٹے سے خطہ میں بھی غیر اللہ کی پرستش ہو، غیر اللہ سے خوف و رجا کا معاملہ ہو، انسانوں کو (خواہ زندہ ہوں، خواہ مردہ) قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھا جاتا ہو، اولاد اور رزق دینے والا باور کیا جاتا ہو، ان کو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و ناظر جانتے ہوں، اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ قطب شمالی میں یا قطب جنوبی میں، یا ہمالہ کی بلند و سبز چوٹی پر ایک متنفس بھی ایسا ہے، جو غیر اللہ کی پرستش کر رہا ہے غیر اللہ کو نافع و ضار سمجھتا ہے غیر اللہ کو اس کائنات پر حکومت کرنے والا سمجھتا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں وہاں پہونچوں، اور اللہ کا پیغام پہونچاؤں۔

یاد رکھو اللہ فرماتا ہے:-

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (الاعراف۔۵۴)

اسی کا کام ہے، پیدا کرنا، اور اسی کا کام ہے حکم چلانا۔

ایسا نہیں کہ پیدا تو اس نے کیا مگر حکم کسی اور کا چل رہا ہے، اس نے اپنی سلطنت کسی اور کے حوالہ کر رکھی ہے، کہ ہم نے پیدا کر دیا تم حکومت کرو، خالق بھی وہی ہے، حاکم اور منتظم (ایڈمنسٹریٹر) بھی وہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ جیسے تاج محل کو شاہ جہاں بادشاہ نے بنوایا، ترکستان وغیرہ سے معمار بلائے، صناعوں نے کاریگری دکھائی، وہ آئے اور چلے گئے، اب تاج محل پر جس کا جی چاہے راج کرے، حکومت کرے، تخت بچھائے، توڑے، بنائے۔

یہ دنیا تاج محل نہیں ہے، یہ دنیا قطب مینار نہیں ہے، یہ دنیا کوئی آثار قدیمہ کا عجائب خانہ نہیں ہے، یہ خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے، سارا نظام اس کی مٹھی میں ہے، اس کے دست قدرت میں ہے، ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی یہاں کا اس نے دوسروں کے حوالہ نہیں کیا ہے "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" (اس کی بادشاہی (اور علم) آسمان وزمین سب پر حاوی ہے) اس کا تخت سلطنت پوری کائنات پر حاوی ہے، اس پورے کرۂ ارض پر حاوی ہے، یہ (زمین کا) ایک سیارہ کیا ہے؟ سارے سیارے، ساری کہکشاں، سارا نظام شمسی، سارا نظام فلکی، یہ سب کے سب اسی کے قبضہ میں ہے۔[۱]

حضرت سید علی ہمدانیؒ کو جو چیز کھینچ کر یہاں لائی، وہ غیرت توحید تھی، یہ بھی آپ یاد رکھئے کہ سید علی ہمدانی نے اس سرزمین کو بزور شمشیر فتح نہیں کیا، محبت سے فتح کیا ہے، روحانیت سے فتح کیا ہے، خلوص سے فتح کیا ہے، درد سے فتح کیا ہے، میں نے عربوں کے ایک جلسہ میں بھی یہ بات کہی، میں نے کہا کہ کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس شخص کی روحانیت کا، اس شخص کی تاثیر کا؟ جس نے تین دورے کئے، اور پورے کے پورے خطہ کو مسلمان بنالیا، مؤرخوں نے کہا ہے کہ انھوں نے تین دورے کئے، ایک دورہ اجمالی کیا، دوسرا قدرے تفصیلی، اور تیسرے دورہ میں گھر گھر گئے اور اللہ کا پیغام پہونچایا، خدا کا ایک بندہ چند ساتھیوں کے ساتھ آتا ہے اور پورا کا پورا خطہ مسلمان ہوجاتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے فضل سے آج بھی وہ مسلمان ہے آج بھی دلوں میں

---

[۱] خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے اپنی مشہور نظم "مسدس حالی" میں خوب کہا ہے۔

خرد و ادراک رنجور ہیں واں ۔ مہ و مہر ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاندار مغلوب و مقہور ہیں واں ۔ نبی اور صدیق مجبور ہیں واں
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں
نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں -

ایمانی حرارت موجود ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس توحید کی امانت کو ان سے چھین نہیں سکتی، اور وہ رشتہ توڑ نہیں سکتی، جو عبد اور معبود کے درمیان ہے۔

میرے بھائیو! یاد رکھو اگر اس خطّہ میں کہیں بھی غیر اللہ کی پرستش ہوتی ہے، ان سے حاجت روائی کا سوال کیا جاتا ہے، کوئی مشرکانہ فعل ہوتا ہے، تو میر سید علی ہمدانی کی روح کو قبر مبارک میں اذیّت ہوتی ہے۔

اس غیرت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کا وقت آخر قریب آیا تو آپ نے خاندان کے سب افراد، بیٹوں، پوتوں، نواسوں کو جمع کیا، اور کہا کہ عزیزو! میرے جگر گوشو! میری پیٹھ قبر سے نہیں لگے گی جب تک تم مجھے یہ اطمینان نہ دلادو کہ میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد کس کی عبادت اور پرستش کرو گے؟ ان لوگوں نے خم ٹھونک کر کے کہا کہ آپ اندیشہ نہ فرمائیں، ہم آپ ہی کے معبود برحق، اور آپ کے باپ دادا، ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے معبود وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ	انھوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا	باپ دادا، ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحاق کے
وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ٥	معبود کی عبادت کریں گے، جو معبود یکتا
(البقرہ۔١٣٣)	ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔

ابّا جان، دادا جان، نانا جان! آپ کیوں ہم سے یہ سوال کر رہے ہیں، آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے؟ آپ اطمینان رکھئے، آپ نے بچپن سے ہماری جس طرح تربیت فرمائی ہے، اور دل کی نرم سرزمین میں توحید کا پاک بیج بویا ہے، اس سے ہم ہٹ نہیں سکتے، ہم آپ کے معبود برحق خدائے واحد ہی کی پرستش کریں گے، جس کی ابراہیم و اسماعیل و اسحاق پرستش

کرتے تھے، اس وقت ان کو اطمینان ہوا، اور دنیا سے خوش خوش رخصت ہوئے، یہ اولیائے عظام، داعیان اسلام بزرگان کرام، ان ہی پیغمبروں کے وارث اور جانشین ہیں، یعقوب علیہ السلام کو کھٹکا اسی بات کا تھا کہ میری اولاد شرک کے جنجال میں اسی طرح نہ پھنس جائے، جیسے ہزاروں خاندان اور سیکڑوں قومیں (اپنے بانیوں اور داعیوں کے بعد) پھنس گئیں۔

میرے بھائیو! جو کچھ عرض کیا گیا اسے گوش دل سے سنئے اور عمل کیجئے، اس وادی کے لئے میر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے رفقاء جو تحفہ اور پیغام لے کر آئے تھے، وہ اصلاً توحید کی دولت تھی، اس کو سینے سے لگائے رکھئے، اللہ تعالےٰ ہی کو اس دنیا کا مالک، افراد اور قوموں کے عروج وزوال کا مالک، دنیا کے سیاہ وسپید کا مالک سمجھئے، اسی کے آستانہ پر سر جھکائیے، یہی پیغام ہے، جو خدا کا ہر پیغمبر لے کر آیا، خدا کے ولیوں نے دنیا کو سنایا، اور مصلحین ومجدّدین نے ہر دور کے لوگوں تک پہونچایا، فتح وکامیابی کی شرط یہی ہے، عزت وطاقت کی شرط یہی ہے، اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، اسی سے دل لگائیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ	جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا
غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ	ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور
الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ○	دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور
(الاعراف۔ ۱۵۲)	ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ممکن ہے لوگ یہ کہیں کہ ہم نے گوسالہ پرستی کب کی؟ اس سے ہزار بار توبہ ایسی احمقانہ

اور شنیع حرکت ہم کب کر سکتے تھے؟ تو اللہ تعالےٰ نے اپنی اس آخری کتاب میں اس کا جواب دیا' اور یہ کہہ کر کہ ہم اسی طرح بہتان باندھنے والوں کو سزا دیتے ہیں' تمام مشرکانہ عقائد و اعمال کو شامل فرمایا کہ شرک کی بنیاد ہمیشہ من گھڑت قصے کہانیوں اور بے اصل و بے تحقیق باتوں پر ہوتی ہے' اور وہ دونوں توأم (جڑواں بچوں کی طرح) ہوتے ہیں' اسی لئے اللہ تعالےٰ شرک کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :-

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ	بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات
وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ٥ (الحج ۳۰)	سے اجتناب کرو۔

شرک کو اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں صاف صاف "افترائے عظیم" کا لقب دیا ہے' فرماتا ہے :-

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰىٓ	اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے
اِثْمًا عَظِيْمًا ٥ (النساء ۔ ۴۸)	بڑا بہتان باندھا۔

میں آپ کو اس وقت اس منبر سے خطاب کر رہا ہوں' جو منبر رسولؐ کا جانشین ہے' مسجد نبوی کے منبر کی نشانی ہے' اس کا پایہ بہت بلند ہے' اس پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ آپ کے سارے مسائل حل ہیں' آپ کی ساری مشکلات کُہر کی طرح چھنٹ جائیں گی' اور سب مصائب کافور ہو جائیں گے' اگر آپ نے توحید کا دامن مضبوط پکڑ لیا' اور جب تک اس سرزمین میں توحید خالص نہیں آتی' اور ہر قسم کے مشرکانہ خیالات و توہمات دور نہیں ہوتے' مجھے اس میں بڑا تردّد اور شبہ ہے کہ ہزار تدبیروں سے بھی مسائل حل ہوں' اللہ تعالےٰ کی مدد نہ ہو تو کوئی تدبیر کارگر نہیں' اور مدد ہو تو پھر کسی کا کھٹکا نہیں :-

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ	اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی
لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ	غالب نہیں آسکتا' اور اگر وہ تمہیں

يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

چھوڑ دے تو پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہیئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

حیاتِ ملّی میں خواصِ امّت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

[یہ تقریر "میر واعظ منزل" میں جمعہ ۳۰ اکتوبر کو بعد نماز عصر علماء، ائمۂ مساجد اور خواص کے ایک مؤقّر مجمع کے سامنے کی گئی۔]

حمد و صلاۃ کے بعد!

جناب میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحب، علمائے کرام! مجھے بڑی خوشی ہے کہ جن حضرات کی خدمت میں مجھے فرداً فرداً حاضر ہونا چاہئے تھا، وہ خود یہاں تشریف لے آئے ہیں، اور ایک جگہ مجھے ان کی زیارت و ملاقات نصیب ہو گئی، میں میر واعظ صاحب کا بہت شکر گذار ہوں کہ جو فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا، اس سے مجھے انھوں نے بہت خوبی، اور بڑی کریم النفسی کے ساتھ سبکدوش کر دیا۔

حضرات! میں اس تھوڑے سے وقت میں ایسے معزز حضرات کی خدمت میں کیا عرض کروں؟!

میں ایک حدیث سے مدد لیتا ہوں، صحیحین کی حدیث ہے "أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ"[1] کلام نبوت کا

---

[1] صحیحین، بخاری و مسلم۔

نور اس میں صاف چمک رہا ہے (غور سے سن لو جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ۔ مضغۂ گوشت ۔ ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو جسم کا پورا نظام درست رہتا ہے، "واذا فسدت فسد الجسد کلہ" اور اگر اس میں بگاڑ آجائے تو پھر پورا جسم بگڑنے لگتا ہے، اس میں فساد پھیل جاتا ہے) معلوم ہے مضغۂ گوشت کیا ہے، کونسا ہے؟ (آپ نے خود ہی اس کی تشریح فرمائی) "ألا وھی القلب، یاد رکھو وہ دل ہے" تو میں سمجھ رہا ہوں کہ جس طریقہ سے جسم انسانی کا ایک قلب ہوتا ہے، امت کا بھی ایک قلب ہوتا ہے، انسانیت کا بھی ایک قلب ہوتا ہے، یہ قلب جسم انسانی کے اندر اپنے فرائض انجام دیتا ہے، اور اس انسانی جسم کا پورا نظام اس پر موقوف ہوتا ہے، یہ قلب اگر خراب ہو جائے (اور اس کی شکلیں بہت سی ہیں) اس بگاڑ کی اور اس بیماری کی نوعیت کچھ ہو لیکن جب قلب اس سے متاثر ہو جاتا ہے تو پورا جسم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اور پورا جسم اپنے اس نقطۂ اعتدال اور اپنے اس مقام سے ہٹ جاتا ہے جس مقام پر وہ تھا، اِس وقت میں سمجھ رہا ہوں کہ میں کشمیر کے قلب، شاید قلب و دماغ دونوں سے خطاب کر رہا ہوں، ہم آپ سب خدا کے فضل سے صاحبِ قلب ہیں، اہل دل تو نہیں کہتا، اہل دل تو بہت بامعنی اور بہت بلند مفہوم رکھنے والا لقب ہے، شیخ سعدیؒ جہاں ذکر کرتے ہیں، "صاحب دلے گفتہ" "صاحب دلے فرمود" کہتے ہیں، اہل دل کا تو بڑا مقام ہے لیکن ہم سب اصحاب قلوب ضرور ہیں، آپ غور فرمائیے، دل کے لئے جادۂ اعتدال پر رہنے کے لئے، اور اپنا فطری وظیفہ بحیثیت ایک مضغۂ گوشت بحیثیت ایک جزء کے (لیکن کُل کی تنظیم کرنے والے اور حفاظت کرنے والے عضو کے) بڑے نازک اور عظیم فرائض ہیں۔

اب میں عرض کروں گا کہ دل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں، تاکہ وہ اپنا فطری وظیفہ

ادا کرسکے اور جسم کا نظام درست رہے، پہلی چیز یہ کہ وہ زندہ ہو، سارا انحصار اس کی زندگی پر ہے، اگر دل مرگیا تو پھر کسی چیز کا سوال نہیں، کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

پہلی شرط ہے کہ دل زندہ ہو، اس کا زندگی سے رشتہ جڑا ہوا ہو، دوسری بات یہ کہ دل میں حرکت ہو، دل متحرک ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ دل کی حرکت بند ہوئی تو دل بھی ختم اور جسم بھی ختم، پھر زندگی کا کوئی سوال نہیں، دل کو حرکت میں رکھنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں، طبّی، جسمانی، عضوی اور اب میکانکی بھی[1] آپ سب جانتے ہیں کہ دل کو حرکت میں لانے کے لئے جس طریقہ سے ایک انسان اپنی زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اسی طرح معالجین اور اطباء اور ہارٹ اسپشلسٹ ہیں، اس کو حرکت میں لانے کے لئے کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حرکت میں آجائے، پھر آگے اس کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائیگی، تیسری شرط یہ ہے کہ دل میں حرارت ہو، دل سرد اور افسردہ نہ ہوجائے، یہ تین شرطیں ہوئیں، حیات، حرکت، حرارت۔

اب میں عرض کروں گا کہ جس خطّہ، جس ملت و امت اور جس خاندان کے خواص ہوں ان کے لئے بھی یہ تین شرطیں ہیں، پہلے یہ کہ وہ زندہ ہوں، دوسرے یہ کہ وہ متحرک ہوں، تیسرے یہ کہ ان کے اندر حرارت ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز چلی جائے اور خواص کا رشتہ زندگی سے منقطع ہوجائے تو پھر عوام کا کیا حال ہوگا، آپ سمجھ سکتے ہیں، یوں سمجھئے کہ خواص پاور ہاؤس (POWER HOUSE) ہیں، ملت اسلامیہ، اور یہ ملت جو آج تک قائم ہے،

---

[1] مثلاً (PACE MAKER) کی ایجاد اسی مقصد کے لئے ہے۔

اپنے اس پاور ہاؤس کے تعلق کی وجہ سے اس کا پاور ہاؤس کبھی بند نہیں ہوا معطل نہیں ہوا، آپ دیکھتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے پاور ہاؤس آپ کے شہر کا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور اس کا ربط ٹوٹ جاتا ہے تو وائرس (بجلی کے تاروں) میں کرنٹ بند ہو جاتا ہے، اور ہر جگہ اندھیرا، اور سردی پھیل جاتی ہے تو ملت کا پاور ہاؤس اس کے خواص ہیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دور میں اس ملت کا پاور ہاؤس بند نہیں ہوا، یہ امت کے تسلسل کی تاریخ درحقیقت خواص کے اصلاحی کارناموں کے تسلسل کی تاریخ ہے، اگر آپ اس کو ذرا گہرائی سے دیکھیں گے تو آپ جس کو ملت اسلامیہ کے بقا کی تاریخ کہتے ہیں، یہ ملت اسلامیہ کے خواص کی بقا اور تسلسل کی تاریخ ہے، ملت میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود تھے، جو خود زندہ تھے، خود متحرک تھے، صاحب حرارت تھے، ان کی وجہ سے ملت کی رگوں میں خون کی تقسیم صحیح ہوتی تھی، آپ جانتے ہیں کہ دل خون تقسیم کرتا ہے، اس کی وجہ سے یہ خون رگوں اور شرائین میں دوڑتا ہے، تو ملت کے قلب نے کبھی اپنا کام بند نہیں کیا، ملتوں پر جو زوال آیا، اور ملتیں مٹ گئیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا پاور ہاؤس بند ہو گیا، آپ عیسائیت کی تاریخ پڑھیں، یہودیت کی تاریخ پڑھیں آپ کو معلوم ہوگا کہ انبیائے بنی اسرائیل کے تھوڑے عرصہ کے بعد اسرائیلی پاور ہاؤس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ کام کیا تھا، احتساب کا کام، امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کام، حق و باطل میں تمیز کا کام، اور بے خوفی، بے رعبی، خدا پر توکل، صحیح کلمۂ حق کہنا، ہر حال میں کوئی ناراض ہو، کوئی راضی ہو، بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس پاور ہاؤس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا، قرآن مجید میں اس کی شہادت ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ

اے ایمان والو (اہل کتاب کے) بہت سے

الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ | عالم اور فقیر لوگوں کا مال ناحق کھاتے
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ | ہیں، اور اللہ کی راہ سے روکتے
عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (التوبہ-۳۴) | ہیں۔

اس سے بڑھ کر شاید شہادت نہیں ہو سکتی کہ بنی اسرائیل کا پاور ہاؤس کیا تھا؟ یہ اس کے احبار و رہبان تھے، ان کے علماء اور مشائخ تھے، احبار و رہبان اگر آپ اس وقت کی اصطلاحات میں، اور اسلامی ٹرمس (TERMS) میں ترجمہ کریں تو "علماء و مشائخ" ترجمہ ہوگا، ان کے اکثر علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے، "وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" یعنی جو کام تھا وہ نہیں کرتے تھے، اور جو کام نہیں کرنا تھا، وہ کرتے تھے، اور اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ پاور ہاؤس نے اپنا اصلی کام چھوڑ دیا، دوسرا کام شروع کر دیا، یہ کانسٹبل جو ٹریفک کنٹرول کرتا ہے، یہ اگر اپنی جگہ چھوڑ دے، اور پانی پلانے لگے، راستہ بتانے لگے تو سواریوں میں ٹکر ہو جائے، بیسیوں حوادث پیش آئیں، حالانکہ وہ کارِ خیر کر رہا ہے، بہت ثواب کا کام کرتا ہے، پیاسے کو پانی پلاتا ہے، دور تک جاتا ہے، راستہ بتانے کے لئے، لیکن وہ مستوجب تعزیر ہوگا کہ اس نے اپنا اصلی کام چھوڑ دیا، ڈیوٹی چھوڑ دی، علماء و مشائخ کا کام کیا تھا؟ اللہ پر بھروسہ کرنا، زہد و قناعت کی زندگی گذارنا، دوسروں کی جیبوں پر نظر نہ ڈالنا دوسروں کے مال کو نہ دیکھنا، اور جو ملے اس پر شکر کرنا، لیکن کیا کرنے لگے "یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" وہ لوگوں کا باطل طریقہ پر مال کھانے لگے، خود محنت نہ کرتے دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتے، دوسروں کی محنت کیا ہے؟ اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا، اس محنت سے تو یہ مفت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن ان کی جو محنت تھی، انھوں نے جو پڑھنے میں محنت کی تھی، علم حاصل کرنے میں محنت کی تھی،

اس کا نتیجہ لوگوں کو وہ دیتے نہیں، یہ اپنی محنت کے نتیجہ میں لوگوں کو شریک نہیں کرتے، اور لوگوں کی محنت کے نتیجہ پر وہ حاوی اور مسلط ہو گئے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ انھیں کی نذر ہو جاتا ہے "وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ" ان کا کام تھا لوگوں کو راستہ بتانا، الٹا راستہ روکنے لگے یعنی بجائے رہبر کے رہزن بن گئے، اگر آپ ملتوں کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا پاور ہاؤس پہلے بند ہوا، اور ملت میں بعد میں فساد آیا، تحریف آئی۔

یہ ہر ملت کی تاریخ ہے لیکن ہماری ملت کی تاریخ یہ ہے کہ مختصر سے مختصر دور میں بھی اس کے پاور ہاؤس نے کام کرنا نہیں چھوڑا، اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے کہ اگر کوئی شخص اس پر قسم کھائے تو وہ حانث نہیں ہوگا (یعنی اس کو کفارہ دینا نہیں ہوگا) اگر میں یہ کہوں کہ اس ملت کی تاریخ میں ایک مہینہ کی مدت بھی ایسی نہیں گذری کہ جس میں اس کا پاور ہاؤس بالکل خاموش ہو گیا ہو، اور کوئی خدا کا بندہ عالم اسلام کے کسی حصہ میں کسی ملک میں بھی نہیں رہا جو حق کو حق کہے، باطل کو باطل کہے تو یہ بات صحیح نہیں، اور اس کی سب سے بڑی شہادت صحاح کی روایت ہے کہ "لا تزال طائفة من أمتي قوامة على امر الله، لا يضرها من خالفها"[1] (میری امت میں ہر دور میں، ہر زمانہ میں ایک جماعت ضرور رہے گی، جو حق پر قائم ہوگی، اور کوئی ان کی کتنی ہی مخالفت کرے، اور ان کی مدد نہ کرے ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔)

اب کسی علاقہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہاں کے خواص جو وہاں کا قلب ہیں وہ یا مردہ ہو جائیں، یا غیر متحرک ہو جائیں، یا ان کی حرارت ختم ہو جائے بس اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ تینوں شرطیں ہم میں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ حیات، حرکت، حرارت، اگر حیات ہے لیکن

---

[1] سنن ابن ماجہ۔

حرکت نہیں ہے، ہماری زندگی میں وقوف و تعطّل پیدا ہوگیا ہے، تو جیسے بہتا ہوا پانی رکنے کے بعد خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور اس میں تعفّن پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہمارے معاشرہ اور حیاتِ ملّی میں بھی فساد آجائیگا، تیسری بات یہ کہ آپ کے اندر حرارت بھی ہو، یعنی آپ کے اندر تعلق مع اللہ، عشق رسول، لقائے رب اور جنت کا شوق، ایمان کی قوت، اور حق بات کہنے کی جرٔت باقی ہو، تو پھر کوئی کتنی ہی سازش کرے اس جسم کو خراب کرنے کی، جسم خراب نہیں ہوگا، لیکن اگر قلب اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو دنیا کی ساری سلطنتیں اور طاقتیں جمع ہو جائیں تو اس جسم کو زندہ نہیں رکھ سکتیں، جس طریقہ سے کسی درخت کی اگر قوتِ نمو ختم ہو جائے تو آپ ہزار مرتبہ ہزار طریقے سے اس پر پانی گرائیں تو وہ درخت سرسبز نہیں رہ سکتا، تھوڑے دن میں وہ گر جائیگا، اور ایندھن بن جائیگا۔

حضرات! ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان میں ہر دور میں ایسے لوگ رہے جو حق بات کہتے تھے، اور ان کے اندر حرارت تھی، حرارت ایمانی اور حرارت عشقی ان کے اندر باقی تھی، جو شخص ان کے پاس بیٹھتا تھا، وہ متاثر ہوتا تھا، ان کے پاس سے گذر جانے والا بھی بعض اوقات محروم نہیں رہتا تھا، اس کو بھی آنچ پہونچتی تھی، اس میں بھی کرنٹ دوڑ جاتا تھا، یہ جو آپ تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کے ذکر میں سنتے ہیں، کہ ان کے اندر بھی توکّل کے بجائے تواکل[1]، اور حرکت کے بجائے تعطل پیدا ہوگیا تھا، اور رسمیت آگئی تھی، تو یہ بعد کی بات ہے، اور کسی حلقہ اور جگہ کے ساتھ مخصوص ہے، ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ لوگ جو صوفیاء اور مشائخ کہلاتے تھے، ان کے ذریعہ سے عوام میں ایمان اور عمل کا ایک کرنٹ دوڑتا تھا، اور اگر ایک شہر میں ایک بھی ایسا آدمی ہوتا تھا تو اس شہر پر غفلت، جاہلیت، خدا فراموشی، دولت پرستی اور

---

[1] ترک سعی و عمل اور دوسروں پر بھروسہ

موقعہ پرستی کا پورا حملہ نہیں ہونے پاتا تھا، ہوتا تھا لیکن یہ نہ تھا کہ پورا معاشرہ اس کا شکار ہوجائے اور اس بہاؤ میں بہہ جائے ایسا نہیں ہوتا تھا، ایک آدمی بیٹھا ہے، خدا کا بندہ اور سارے شہر میں ایک گرمی سی معلوم ہوتی ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی میں بیٹھے تو معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا مرکز ثقل یہی ہے کیا سرکار، کیا دربار، کیا امیر کیا وزیر، کیا شاعر کیا ادیب، کیا عالم، ساری مخلوق ان کی طرف چلی آرہی ہے، پھر خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا دور آیا، اور سارا ماحول روشنی اور گرمی سے معمور و مخمور ہوگیا، ہر شہر میں ایسا رہا ہے، آپ اپنے کشمیر ہی کو دیکھ لیجئے، یہاں اللہ کا ایک شیر آیا، حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور سارے خطے کو انھوں نے مسلمان بنادیا، اور آج بھی ان کے خلوص کی برکت ہے، ان کی للّٰہیت کی برکت ہے، ساری خرابیوں کے باوجود بھی یہاں مسلمان ہیں، یہ کیا تھا؟ یہ وہی قلب کی حرکت و حرارت ہے، ایک قلب اس کا تناسب کیا ہوتا ہے، آپ دیکھئے جسم انسانی کتنا بڑا ہے اور قلب کتنا چھوٹا ہے، لیکن یہ چھوٹا سا ٹکڑا (مضغۂ گوشت) سارے جسم پر حکومت کرتا ہے، اور سارے جسم کا صلاح و فساد اس سے مربوط ہے، خواص میں تعطل پیدا ہونا، خواص میں دنیا طلبی آنا، خواص میں دولت پرستی کا آنا، خواص میں انتشار پیدا ہونا اصل خطرے کی بات ہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک بزرگ نے سنایا کہ حیدرآباد میں ایک بزرگ کے گھٹنے میں درد ہوگیا تھا تو میں اس میں قیروطی مل رہا تھا (جو وجع مفاصل اور جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے) ان کے خدّام، معتقدین، مریدین جن کا بڑا حلقہ تھا جب مجلس میں بیٹھتے تھے، خاموش مؤدّب، بالکل معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، "کأنّ علی رؤسھم الطیر" حضرت فرماتے ہیں، سب سنتے ہیں، اس دن معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی کہ

ایک یہاں سے بولا، ایک نے بات کہی ایک نے اس کو کاٹا، کسی نے اس کا جواب دیا، اور بالکل معلوم ہوتا کہ بزرگوں کی مجلس نہیں ہے، ہم کسی منڈی میں پہونچ گئے ہیں مچھلی بازار یا سبزی منڈی میں، اِدھر سے شور اُدھر سے شور، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ آج ہوا کیا؟ آج یہ کیا نئی بات ہے کہ یہاں بزرگ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ بنفس نفیس موجود لیکن آج معلوم ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو احساس ہی نہیں کہ بزرگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، انھوں نے میرا استعجاب وحیرت دیکھی تو گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، میں سمجھا کہ یہاں درد زیادہ ہو رہا ہے تو میں وہاں ملنے لگا، پھر مجھے تعجب ہوا کہ لوگ اب بھی خاموش نہیں ہو رہے ہیں تو انھوں نے پھر گھٹنے کی طرف اشارہ کیا، تو میں ادھر ملنے لگا، میں نہیں سمجھا کہ کیا بات ہے، اس وقت وہ بزرگ میرے کان کے پاس منھ لائے، اور فرمایا کہ گھٹنے کے درد کی وجہ سے میں رات کے معمولات پورے نہیں کرسکا ہوں اس کی بے برکتی اور اس کی نحوست ہے، جو تم دیکھ رہے ہو، اچھا میں پوچھتا ہوں کہ ایک بزرگ کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا جب یہ نتیجہ محفل پر ہوا تو کثیر التعداد خواص کے اپنے معمولات کے چھوڑ دینے کا کیا نتیجہ ماحول اور معاشرہ پر ہوگا؟ اب آپ ضرب لگائیے کہ ایک کا اثر اتنا تو چار کا کتنا، تو آٹھ کا کتنا، تو پچاس کا کتنا، تو اگر کسی جگہ کے سب خواص ایسے ہو جائیں، (خدانخواستہ) تو کیا حال ہوگا؟ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اسی حالت کو دیکھ کر کہا ہے ؎

رحم کر قوم کی حالت پہ تو لے ذکرِ خدا

بے ادب ہو گئی محفل تیرے اٹھ جانے سے

جب خواص کو عوام دیکھیں کہ دولت کی اہمیت ان کے دل میں بھی وہی ہے، عہدہ اور عزت کی اہمیت ان کے دل میں بھی وہی ہے جو ہمارے دل میں ہے تو بتائیے کہ

پھر عوام پر کیا اثر ہوگا۔؟

کسی زمانہ میں خواص کا عالم تو یہ تھا کہ اللہ کا ایک بندہ ایک جگہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ وہاں کے بادشاہوں اور حاکموں کو منہ نہیں لگاتا، ایک بزرگ کا میں واقعہ سناتا ہوں، ان کا نام ہے شیخ الاسلام عزّ الدین بن عبد السلام، سلطان العلماء کا خطاب تھا، اپنے زمانہ کے بہت بڑے (شاید سب سے بڑے) شافعی عالم تھے، دمشق میں قیام تھا، بادشاہِ وقت کی کسی بات پر خطبہ میں نکیر کی، بادشاہ کو ناگوار ہوا، بادشاہ نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو علماء کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے تھا، بے رُخی، اور بے توجہی، اس کے بعد وہاں کہیں سے اس کے معزز مہمان آئے، وہ بھی اپنے یہاں کے بادشاہ اور حاکم تھے، ان کو معلوم تھا کہ اس ملک کے سب سے بڑے عالم شیخ عزّ الدین بن عبد السلام ہیں، اور آج کل وہ معتوب ہیں، انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں ایسا کوئی عالم ہوتا تو ہم اس کو سر پر بٹھاتے، تعجب ہے کہ آپ اپنے یہاں کے ایسے عالم کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں، بادشاہ نے بُرا نہیں مانا، اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، لیکن بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتے ہیں، اس کو یہ خیال ہوا کہ اگر میں ایسے ہی چپ چاپ معافی مانگ لوں، اور کہوں مجھ سے غلطی ہوئی تو میری سبکی ہوگی، اور میرا رعب کم ہو جائیگا، تو خواص میں سے کسی کو بلایا، اور کہا کہ دیکھو حضرت سے یہ کہنا کہ میں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا ہوں تو وہ تشریف لائیں اور دست بوسی کرلیں، میرا احترام قائم رہے گا، لوگ بھی دیکھ لیں گے، اس کے بعد بات رفع دفع ہو جائیگی، جب کسی نے ان سے جا کر کہا تو انھوں نے کہا کہ تم کس خیال میں ہو؟ واللہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ وہ میری دست بوسی کرے، چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں، یہ لفظ تاریخ میں موجود ہے، بالکل ان کے الفاظ "لا أرضى أن يقبّل يدي فضلاً عن أن أقبّل يده" ایسے ہی ہمارے

دہلی کے (جو حقیقی سلاطین دہلی کہلانے کے مستحق ہیں) بہت سے مشائخ عظام کا بھی یہی حال تھا، بادشاہ دہلی نے ایک مرتبہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں سے کہا اللہ نے مجھے بڑی دولت دی ہے، حکومت دی ہے کچھ قبول فرمائیں، فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ" قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ"[1] دنیا کی متاع قلیل ہے، اس قلیل میں سے ایک قلیل ٹکڑا ہندوستان ہے، پھر اس میں سے ایک قلیل ٹکڑا وہ جو آپ کے قبضہ میں ہے (مثل مشہور تھی، سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم) اگر اس اقل قلیل میں سے میں بھی حصہ بٹاؤں تو کیا رہ جائیگا؟ ایسے ہی ایک مرتبہ بادشاہ نے کہا کہ میں ایک رقم پیش کرتا ہوں، آپ نے معذرت کی، بادشاہ نے کہا غرباء میں تقسیم فرمائیں، فرمایا، مجھے اس کا بھی سلیقہ نہیں، آپ اپنے لوگوں کے ذریعہ تقسیم کرادیں، یہاں سے بانٹتے چلے جائیے قلعہ تک پہونچتے پہونچتے ختم ہو جائیگی، نہ ختم ہوگی تو وہاں جا کر ختم ہو جائیگی ایسے ہی سیکڑوں قصے ہیں۔

یہ مثالیں تھیں، جو لوگوں کے دلوں میں گرمی پیدا کرتی تھیں، دنیا کی، مال کی محبت فطرتِ انسانی ہے" وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ"[2] مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں یہ مثالیں جب آتی تھیں، استغنا کی، بے نیازی کی، دنیا کے جاہ وحشم سے بے رغبتی کی، تو لوگوں میں ایمان تازہ ہو جایا کرتا تھا، اور قوتِ مقابلہ ابھر آتی تھی، اور پھر مسلم معاشرہ تنکے کی طرح نہیں بہتا تھا، جیسے آج بہتا ہے۔

خواص کے لئے صرف حیات وحرکت ہی کافی نہیں، بلکہ حرارت بھی ضروری ہے، اور حرارت کہاں سے پیدا ہوتی ہے، حرارت پیدا ہوتی ہے ذکر اللہ سے، حرارت پیدا ہوتی ہے، دعا اور مناجات وتوکّل سے، اللہ کے راستہ میں تکلیف اور کچھ مجاہدہ کرنا پڑے تو

---

[1] النساء-۷۷ [2] العٰدیٰت-۸

دل میں حرارت پیدا ہوتی ہے، یہ فقر و قناعت کے قصے جو آپ تاریخ میں پڑھتے ہیں، اور یہ حضرات جن کے قصے ہیں، انھوں نے کسی مجبوری سے اس کو نہیں اختیار کیا تھا، یہ ان کے دل کی آواز تھی، اور اس مجبوری سے ضرور اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے دل سے مجبور تھے، یعنی اندر سے کوئی ان کے یہ کہتا تھا کہ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ہم دولت کے بندے نہیں ہیں، ہم طاقت و اختیار کے بندے نہیں ہیں۔

اس کی ضرورت ہے کہ یہ خواص کا طبقہ باقی رہے، اپنی خصوصیات کے ساتھ اس میں زندگی رہے، اس میں حرکت رہے، اس میں حرارت رہے، اور کوئی جگہ کوئی مقام اللہ کے ان بندوں سے خالی نہ ہو، جن کو کوئی تہمت نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ بک گئے، ہزار تہمتیں سہی، فلاں نے غلطی کی، فلاں کے علم میں فلاں کمی ہے، فلاں چیز نہیں بنائی لیکن یہ کہ بک گئے کسی کو یہ تہمت نہ لگائی جا سکے، یہ سمجھئے کہ امت کی حفاظت کا گُر ہے کہ ایک ہی دو آدمی چاہے ہوں لیکن ایسے ہوں کہ شکوک و شبہات سے بالاتر ہو چکے ہوں "مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ"[۱] جو حضرت یوسفؑ کے متعلق امرأۃ العزیز نے یہ بات کہی تھی، جب بادشاہ نے پوچھا کہ آخر قصہ کیا ہے؟ تمام شہر میں چرچا ہے، تو اس نے کہا "مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ" سچی بات یہ ہے کہ کوئی کمزوری ہم نے ان میں نہیں دیکھی، تو آج بھی امرأۃ العزیز ہی کا مقابلہ ہے، دولت کو امرأۃ العزیز زلیخا کہہ لیجئے، طاقت کو زلیخا کہہ لیجئے، وجاہت کو زلیخا کہہ لیجئے، اور یوسفؑ مصری، یوسف عزیز کون ہیں؟ دین! دین کو ایسا ہی ہونا چاہئے کہ کوئی اس کو خرید نہ سکے، اور سب شہادت دیں کہ "مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ" در و دیوار سے یہ آواز آئے کہ کھرا سونا ہے جس کا جی چاہے پرکھ لے، سچی بات یہ ہے کہ امت کا مزاج جو اس وقت تک باقی ہے،

---

[۱] یوسف - ۵۱

یہ انھیں بندگان خدا، اور اہل دل کی وجہ سے ہے کہ جن کی وجہ سے یہ امت ہوا میں اڑ نہیں گئی، جیسے اور امتیں خشک پتوں، تنکے کی طرح اڑ گئیں، یا پانی میں بہہ نہیں گئی، جیسی اور امتیں خس وخاشاک کی طرح بہ گئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس ملت کی ہدایت اور اس کا دینی احتساب کا کام جاری ہو، نمازوں میں ترقی ہو رہی ہے، اس پر نظر ہو کہ تناسب کم ہو رہا ہے؟ یا بڑھ رہا ہے، مسجدیں خالی ہو رہی ہیں کہ بھر رہی ہیں؟ قمار خانے زیادہ آباد ہیں کہ مسجدیں زیادہ آباد ہیں؟ مسلمانوں میں کوئی نئی بیماری تو نہیں پھیل گئی، مثلاً شراب نوشی، قمار بازی کی، یا کسی خراب عادت اور بیماری کی ترقی تو نہیں ہے؟ اس سب کی فکر رکھنا، اور اس سے متفکر اور غمگین ہونا، اس کا صدمہ ہونا کہ مسلمانوں میں یہ چیز غلط پھیل رہی ہے، اچھی چیز ختم ہو رہی ہے، خواص امت کا فریضہ اور طبعی وظیفہ ہے، یہ تبلیغی جماعت کا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے خواص کو عوام تک پہونچا دیا، پہلے عوام کو خواص کے پاس لاتے تھے، اس نے خواص کو عوام سے جوڑ دیا، میں یہ نہیں کہتا کہ یہی واحد طریقہ ہے، لیکن عوام سے ربط ہونا چاہئے، ان کے پاس جانا چاہئے، محلوں اور گلیوں میں جانا چاہئے تاکہ دیکھا جا سکے کہ دین بڑھ رہا ہے، یا گھٹ رہا ہے، ترقی ہے کہ تنزلی ہے، کیا چیز نئی پیدا ہوئی، اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کہا ہے ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

حضرات! میں اس وقت اس حال میں نہیں ہوں کہ اس سے زیادہ عرض کروں، اور نہ اس کی ضرورت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مغز کی بات ہو چکی،[1] آخر میں میں حدیث شریف

---

[1] مقرر تقریر ختم کر کے بیٹھ گئے تھے کہ ان کو ایک بات یاد آئی، انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ عقیدۂ توحید
(باقی ص۳۶ پر)

برکت کے لئے دہراتا ہوں" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم: "ألا إنّ فی الجسد مضغۃ إذا صلحت صلح الجسد کلہ وإذا فسدت فسد الجسد کلہ ألا وھی القلب۔"

(باقی ص۳۵ کا) راسخ کرنے، شرک کی بیخ کنی اور عقائد کی اصلاح میں قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی تریاق اور قوی التاثیر چیز نہیں ہے، علماء کو چاہئے کہ وہ شہر اور ملک کے مختلف مقامات پر درس قرآن کو رواج دیں، اور شرح و تفسیر میں خاص طور پر عقیدۂ توحید اور ردّ شرک پر زور دیں، پنجاب میں مولانا حسین علی صاحب (ساکن وان بچھراں ضلع میانوالی) اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے اس سے بڑا کام لیا، اور ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو اس سے نفع پہونچا اور ان کے عقائد کی اصلاح ہوئی۔

دین کا نبوی مزاج، اور اس کی حفاظت کی ضرورت

[یہ تقریر مرکز جماعت اسلامی کشمیر (سری نگر میں) جماعت کے رفقاء، ہمدردوں، اور کارکنوں اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کے سامنے ۳ نومبر ۱۹۸۱ء بروز شنبہ قبل ظہر کی گئی۔]

حمد و صلوٰۃ و خطبۂ مسنونہ کے بعد!

جناب قائم مقام امیر جماعت[1]، رفقاء، احباب اور معزز حاضرین! میں سب سے پہلے تو آپ کی اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا اظہار آپ نے اس دعوت اور پھر اس سپاسنامہ کے ذریعہ کیا، اللہ تعالیٰ آپ کے حسن ظن کو حق بجانب ثابت کرے، اور توقعات کو پورا کرے جن کا آپ نے اس محبّانہ سپاسنامہ میں اظہار فرمایا ہے، میرا احساس ہے کہ اس وقت میں ایک ایسی صاحب علم و فکر جماعت سے خطاب کر رہا ہوں جس کی تشکیل فکر و مطالعہ پر ہوئی ہے، یہ عوام کا کوئی مجمع نہیں ہے، اس لئے میری تقریر میں اگر خطیبانہ عنصر نہ ہو تو آپ اس کو بے محل نہ سمجھیں۔

آپ نے جس محبت، حسن ظن اور اعتماد کا اظہار فرمایا ہے، اس کا بھی حق ہے، اور میرے

---

[1] امیر جماعت مولوی سعد الدین صاحب حج میں گئے ہوئے تھے، اور قاری سیف الدین صاحب ان کے قائم مقام تھے

ضمیر اور میرے محدود فکر و مطالعہ اور تجربہ کا بھی تقاضہ ہے کہ میں آپ کے سامنے وہ چیز رکھوں جو مجھے خود بھی عزیز ہے، اور اس کو اہم اور ضروری سمجھتا ہوں، حدیث میں آتا ہے "لا یؤمن أحدکم حتی یحبّ لأخیہ مایحبّ لنفسہ" "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا (لفظ تو حدیث کے یہی ہیں، مگر ہمارے علماء نے بہت سے اعتراضات اور خدشوں سے بچنے کے لئے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا") جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" ذمہ دار حضرات اور جماعت کے افراد سے اس کی بھی امید کرتا ہوں کہ جس تناسب اور جس انداز سے میں بات کہہ رہا ہوں، اسی تناسب اور انداز کے ساتھ آپ اخذ بھی کریں گے، اور اسی طرح دوسروں تک بھی پہونچائیں گے۔

حضرات! جس جماعت سے کسی تعلیم، تحریک، فلسفہ یا دعوت کو اخذ کیا جاتا ہے، اسی جماعت کا مزاج اس تحریک، تعلیم یا دعوت یا فلسفہ میں جاری ساری ہوتا ہے، یہ ایک قدرتی بات، ایک فطری عمل اور سنۃ اللہ ہے، آپ جن استادوں سے پڑھتے ہیں، ان استادوں کا طریق فکر، بلکہ انداز گفتگو بعض اوقات چال ڈھال بھی ان سے ملنے لگتی ہے، آپ جس گروہ کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، شعوری یا غیر شعوری طریقہ پر آپ کے فکری سانچہ کو، آپ کے احساسات کو، آپ کے طریق تعبیر اور اظہار مافی الضمیر کو متأثر کرتا ہے، یہ قدرتی بات ہے، ایک فن طب ہی کو لیجئے (خواہ طب قدیم ہو یا طب جدید) میں نے دیکھا ہے، اسی طریقے سے ہونہار شاگرد نسخہ لکھتے ہیں، اسی طریقہ سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، وہی پرہیز اور اسی طرح کی احتیاطیں بتاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات دیکھا ہے کہ وہ نقل بالکل مطابق اصل ہوتی ہے، اسی طریقہ سے جو لوگ کشتی کا فن سیکھتے ہیں، وہ اپنے استادوں کے کرتب، داؤں پیچ، اکھاڑے میں

اترنے اور ڈوڈو ہاتھ کرنے کا انداز اپنا لیتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی غزل (اور شاعری کے متعلق کہا ہے اگرحقیقت اس سے زیادہ وسیع ہے۔ ع

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ دین جس کی نعمت سے اللہ نے ہم کو اور آپ سب کو سرفراز فرمایا ہے، نہ دانشوروں سے اخذ کیا گیا ہے، نہ حکماء و فلاسفہ سے، نہ سیاستدانوں سے، نہ اہل حکومت و بانیان سلطنت سے، نہ فاتحین سے نہ خالص ذہین لوگوں سے، یہ ماخوذ ہے انبیاء علیہم السلام سے اس لئے اس دین کے اخذ کرنے والوں میں، اس دین پر چلنے والوں میں، اس دین کی دعوت دینے والوں اور دین کا فکر پیش کرنے والوں میں، انبیاء علیہم السلام کا مزاج جاری و ساری ہونا چاہیئے، یہی اس "دانشگاہ" کے طالب علموں کی سب سے بڑی ترقی، سعادت اور (تعبیر غلط نہ ہو تو) معراج ہے کہ وہ "نبوی مزاج" زیادہ سے زیادہ اخذ کریں، اور اس میں کامیاب ہوں۔

میں اس موقعہ پر آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں جس سے شاید میری بات زیادہ سمجھ میں آئے، کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کے پاس ایک بہروپیا آتا تھا، وہ مختلف روپ بدل کر آتا تھا، اورنگ زیب ایک فرزانہ و تجربہ کار شخص تھے، جو اس طویل و عریض ملک پر حکومت کر رہے تھے، اس کو پہچان لیتے، وہ فوراً کہہ دیتے کہ تو فلاں ہے، میں جانتا ہوں، وہ ناکام رہتا، پھر دوسرا بھیس بدل کر آتا پھر وہ تاڑ جاتے اور کہتے میں نے پہچان لیا تو فلاں کا بھیس بدل کر آیا ہے تو تو فلاں ہے، بہروپیا عاجز آگیا، اخیر میں کچھ دنوں تک خاموشی رہی، ایک عرصہ تک وہ بادشاہ کے سامنے نہیں آیا، سال دو سال کے بعد شہر میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ کوئی بزرگ آئے ہوئے ہیں، اور وہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر خلوت نشین ہیں، چلہ کھینچے ہوئے ہیں، بہت مشکل سے لوگوں سے ملتے ہیں، کوئی بڑا خوش قسمت ہوتا ہے جس کا وہ سلام

یا نذر قبول کرتے ہیں، اور اس کو باریابی کا شرف بخشتے ہیں، بالکل یکسو اور دنیا سے گوشہ گیر ہیں، بادشاہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کے مکتب کے پروردہ تھے، اور ان کو اتباع سنت کا خاص اہتمام تھا، وہ اتنی جلدی کسی کے معتقد ہونے والے نہیں تھے، انھوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، ان کے ارکین دربار نے کئی بار عرض کیا کہ کبھی جہاں پناہ بھی تشریف لے چلیں، اور بزرگ کی زیارت کریں، اور ان کی دعا لیں، انھوں نے ٹال دیا، دو چار مرتبہ کہنے کے بعد بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا بھئی چلو کیا حرج ہے، اگر خدا کا کوئی مخلص بندہ ہے اور خلوت گزیں ہے، تو اس کی زیارت سے فائدہ ہی ہوگا، بادشاہ تشریف لے گئے، اور مؤدّب ہو کر بیٹھ گئے، اور دعا کی درخواست کی، اور نذر دکھائی، درویش نے لینے سے معذرت کی، بادشاہ وہاں سے رخصت ہوئے تو درویش کھڑے ہو گئے، اور آداب بجالائے، فرشی سلام کیا، اور کہا کہ جہاں پناہ! مجھے نہیں پہچان سکے، میں وہی بہروپیا ہوں جو کئی بار آیا، اور سرکار پر میری قلعی کھل گئی، بادشاہ نے اقرار کیا، کہا کہ بھائی بات تو ٹھیک ہے، میں اب کی نہیں پہچان سکا، لیکن یہ بتاؤ کہ میں نے جب تمہیں اتنی بڑی رقم پیش کی جس کے لئے تم یہ سب کمالات دکھاتے تھے، تو تم نے کیوں نہیں قبول کیا، اس نے کہا سرکار! میں نے جن کا بھیس بدلا تھا، ان کا یہ شیوہ نہیں، جب میں ان کے نام پر بیٹھا، اور میں نے ان کا کردار ادا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو پھر مجھے شرم آئی کہ میں جن کی نقل کر رہا ہوں، ان کا یہ طرز نہیں کہ وہ کسی بادشاہ کی رقم قبول کریں، اس لئے میں نے نہیں قبول کیا، اس واقعہ سے دل و دماغ کو ایک چوٹ لگتی ہے کہ ایک بہروپیا یہ کہہ سکتا ہے، تو پھر سنجیدہ لوگ، صاحب دعوت انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کر کے ان کا مزاج اختیار نہ کریں، یہ بڑے ستم کی بات ہے، میں نے یہ لطیفہ تفریح طبع کے لئے نہیں، بلکہ ایک حقیقت کو ذرا آسان طریقہ پر ذہن نشین کرنے کے لئے سنایا۔

ہم داعی و مبلّغ ہوں، یا دین کے ترجمان یا شارح، ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے اخذ کی ہے، اگر انبیاء علیہم السّلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی، قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب جنت والوں کو آخرت میں انعام ملے گا، اور وہ جنت میں پہونچیں گے تو وہ کہیں گے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ"[1] (شکر ہے اس خدا کا جس نے کہ ہمیں یہاں تک پہونچایا، اور ہم یہاں تک پہونچنے والے نہ تھے اگر اللہ ہمیں یہاں تک نہ پہونچاتا) ہدایت کے معنی پہونچانے کے ہیں، اس کے بعد انھوں نے ایک بڑی حقیقت بیان کی جس کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں، ہم جو یہاں تک پہونچے، عقل و دانش کی راہ سے نہیں پہونچے، تجربہ کی راہ سے نہیں پہونچے، اشراقیت نفس کُشی اور ریاضت و مجاہدہ کی راہ سے نہیں پہونچے، فلسفہ و حکمت کی راہ سے بھی نہیں پہونچے، پہلے تو انھوں نے اجمالاً کہا ہے "وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ" (ہماری رسائی یہاں تک نہ تھی، اگر خدا ہمیں یہاں تک نہ پہونچا دیتا) لیکن خدا کے پہونچانے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے، تو اس کا ذریعہ کیا ہوا؟ "لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" ہمارے رب کے قاصد حق لے کر آئے، جانِ سخن یہ ہے کہ خدا کے ایلچی اور سفیر حق لے کر نہ آتے تو ہم یونہی بھٹکتے رہتے، اور آج جنت کے بجائے ہمارا کوئی دوسرا مقام ہوتا، تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ جس چیز نے ہم کو اس قابل بنایا، وہ چیز دانشوروں، فلسفیوں، سیاست دانوں، اور تجربہ کاروں سے اخذ کی ہوئی نہیں ہے، پیغمبروں سے اخذ کی ہوئی ہے، اور اس کا کوئی ذریعہ نبوت و رسالت اور اس کے حاملین (انبیاء کرام) کے علاوہ نہیں ہو سکتا، ہم نے

---

[1] الاعراف - ۴۳

اس کو قبول کرلیا تو اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالٰی کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں ان سعادتوں اور صداقتوں سے فیض یاب اور بہرہ اندوز ہوں، اور دوسروں تک بھی ان کو پہونچائیں۔

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کے لئے محرک کیا چیز ہوتی ہے؟ نبی کے سوچنے کا انداز کیا ہوتا ہے؟ اس لئے میں اس وقت آپ کے سامنے تین چیزیں عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ نبی کی دعوت، جدّوجہد، اور قول وعمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یا وہ ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہوجائے بس مجھے سب کچھ مل گیا. طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں، اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی امیدوں، اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گذار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی، اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہ) آپ وہاں پہونچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداروں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کردیا اور انھوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے، اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہوگئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے، اور کیا ہوا، یہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں، اسی حالت میں آپ نے یہ دعا فرمائی، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے، آپ نے فرمایا" اللھمّ الیك أشکو ضعف قوّتی وقلّۃ حیلتی وھوانی علی الناس، ربّ المستضعفین إلی من تکلنی إلی بعید یتجھّمنی

أو إلى عدو ملكته أمري" میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں، فرماتے ہیں کہ اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں اپنی کمزوری کا، اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی، بے بسی و بے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے؟ ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالہ کرتا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میری زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے، اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معاً فرماتے ہیں "إن لم يكن بك علي غضب فلا أبالي غير أن عافيتك هي اوسع لي" (اگر تو ناراض نہیں ہے، تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ انسان ہوں تیری عافیت کا طالب ہوں) تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیاد ہوتی ہے، وہ رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہونچاتے ہیں، اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہونچا دیا، اور ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا تو پھر ان کو بالکل پروا نہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ "لَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا" پچاس برس کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے، اور انھوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کر دیئے، سورہ نوح کی آیات پڑھئے:۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا	کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات
وَنَهَارًا ۝ (نوح ۔ ۵)	اور دن بلایا۔
ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ	پھر میں نے انھیں علانیہ بھی کہا، اور

لَهُمْ اِسْرَارًا۝ (نوح ـ ۹) مخفی طور پر بھی کہا۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ "وَمَآ اٰمَنَ مَعَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ"[1] ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، لیکن ان کو اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا، وہ میں نے کر دیا، میں نے اپنے رب کو راضی کر دیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ دین کے ہر عمل کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اس رضائے الٰہی کے سلسلہ میں اگر ساری سلطنت ہمارے ہاتھ سے نکلتی ہو تو وہ سلطنت نکلی نہیں بلکہ آئی، اور رضائے الٰہی کے بغیر ہفت اقلیم کی سلطنت ملتی ہو تو وہ سلطنت ملی نہیں بلکہ کھوئی، اس لئے میں حضرت حسینؓ کے کارنامہ کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں، اور میں ان کو بالکل ناکام نہیں سمجھتا، انھوں نے ایک نظیر قائم کر دی کہ حق کے لئے کس طرح سینہ سپر ہوا جاتا ہے، کس طرح جان دی جاتی ہے، انھوں نے اس کی نظیر قائم کر دی کہ کسی غلط چیز کے خلاف (خواہ اس پر کوئی لیبل لگا ہو) اگر آدمی جدوجہد کرے تو اس کا جواز ہے، اگر حضرت حسینؓ کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو بعد میں بڑی مشکل پیش آتی، کہیں کھلے طریقہ پر دین کو پامال کیا جا رہا ہے، یا اسلام کشی، اسلام دشمنی کی جا رہی ہے، یا دین میں بالکل تحریف کی جا رہی ہے لیکن اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی جا سکتی کہ عہد سعادت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔

فرق تو بہت بڑا ہے، تاریخ کا بھی بڑا فاصلہ ہے، اور شخصیت کا بھی بڑا فرق ہے، لیکن یہی معاملہ شہدائے بالاکوٹ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ہے کہ آج ایک چپہ زمین پر ان کی یا ان کی جماعت کی حکومت نہیں، اور خدا کا شکر ہے، اور میں اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرتا ہوں، میرا بھی ان کے خاندان سے

---

[1] ہود ـ ۴۰

تعلق ہے، الحمد للہ ہم نے ان کے کام اور ان کے نام سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، ہمارے خاندان کے افراد ملازمتیں کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، عام مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں نہ کوئی سجّادگی ہے، نہ کوئی مجاوری، اور نہ یہ کہ انھوں نے جو ریاست بنائی تھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن ہم خوش اور مطمئن ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا، اور خدا کے سامنے سرخرو ہیں ؎

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ سربلندی اور اقتدار اور حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ :۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ	یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا	کریں گے جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے
فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○	اور نہ فساد چاہتے ہیں، اور اچھا انجام متقین
(القصص۔۸۳)	کے لئے ہے۔

لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے :۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ	ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تمہیں اعلیٰ ہو تمہیں کو
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران ۱۳۹)	علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو۔

اب دونوں میں تطبیق کس طرح دیں گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علو مت چاہو،

ہم علو دیں گے، چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا، اور تواضع اور ایثار اور قربانی سے کام لیا، اللہ تعالےٰ نے جتنا منظور تھا، ان کو علو عطا فرمایا، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو اور رضائے الٰہی کے ساتھ اگر ساری دنیا کے فوائد اور ساری دنیا کے مفادات سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کامیابی ہے، اور رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلّف کے، اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہو جاتا ہے قرآن شریف میں اسی مضمون کو اس طرح سے ادا کیا گیا ہے "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" [1] جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا) اس میں غیر اللہ کے مقابلہ میں کوئی اور محرک کوئی اور طاقت کوئی اور خواہش نہ ہو، اور حضرت ابراہیمؑ کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے "اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ" [2] (جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے) قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ جاری رہنی چاہیئے، اور برابر اپنے قلب کا احتساب جاری رہنا چاہیئے کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادّی مفادات، علو اور سربلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے، اقبالؔ نے صحیح کہا ہے۔

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اِنّ الشیطان یجری من المؤمن مجری الدم" شیطان مومن کے جسم میں بعض اوقات اس طرح سرایت کر جاتا ہے، جس طرح خون رگوں میں

---

[1] الشعراء ۔ ۸۹-۹۰ [2] الصّٰفّٰت ۔ ۸۴

دوڑ جاتا ہے۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت یہی قلبِ سلیم کی دعوت تھی، تزکیۂ و احسان کا لبِّ لباب، اور اللہ کے مخلص بندے جو نفوس اور قلوب کا علاج کرتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ قلبِ سلیم پیدا ہو، وہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے قلبِ سلیم کے حامل ہو جائیں، ان کے اندر سے دنیا کی محبت، مال کی محبت، جاہ کی محبت، اور اولاد کی وہ محبت (جو اللہ تبارک و تعالےٰ کے احکام کی تعمیل میں مزاحم ہو) نکل جائے۔

دوسری یہ ہے کہ وہ انبیاء (اور نائبین انبیاء) دین کی تعلیم، اور اللہ تبارک و تعالےٰ کے احکام کے بارے میں بڑے غیور ہوتے ہیں، وہ اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں کرتے، وہ اس کو جوں کا توں، بے کم و کاست پہونچاتے ہیں، نہ کوئی (ذہنی) رشوت قبول کرتے ہیں، اور نہ کوئی رشوت دیتے ہیں، کوئی مانے نہ مانے، کوئی ان کی طرف آئے یا نہ آئے، وہ اپنی بات اسی انداز میں کہتے ہیں جس انداز میں خدا نے ان کو وہ بات عطا کی اور سمجھائی ہے، مثلاً ایسا ہوا کہ کفار نے مسلمانوں سے کہا کہ کچھ دن تم ہمارے بتوں کی عبادت کر لو، اور کچھ دن ہم تمہارے بتوں کی، خدا کے پیغمبرؐ نے جواب دیا، ہرگز نہیں:۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ	نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا
عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ (الکافرون ۲-۳)	ہوں، اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔

طائف کے قبیلۂ ثقیف نے چاہا تھا کہ "لات" کو جو قبیلہ بنی ثقیف کا بڑا بت تھا، گویا قریش کے بت "ہُبل" کا ہمسر تھا، نہ توڑا جائے، اور اس کی کچھ عرصہ تک عبادت کرنے کی اجازت دے دی جائے انھوں نے کہا کہ ایک سال؟ فرمایا ہرگز نہیں، چھ مہینے؟ فرمایا ہرگز نہیں، ایک مہینہ؟ فرمایا ہرگز نہیں، ایک دن؟ ہرگز نہیں، اور اس کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا، انھوں نے جا کر اس کو پاش پاش کر دیا، انھوں نے کہا کہ ہم دین میں داخل ہوتے ہیں لیکن نماز سے ہم کو معاف کر دیا جائے، فرمایا "لاخیر فی دین

لا رکوع فیہ" ایسے دین میں کچھ رکھا نہیں جس میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو۔

تو ایک بات تو یہ ہے کہ وہ کسی قسم کا سمجھوتہ (COMPROMIZE) نہیں کرتے، وہی زبان، وہی الفاظ بولتے ہیں، جو ان کے پیغام اور کارِ رسالت سے مناسبت رکھتے ہیں، آخرت کی صاف صاف دعوت دیتے ہیں، جنت و دوزخ کو پیش کرتے ہیں، ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے زمانہ میں بھی مختلف فلسفے ہوتے ہیں، ان کے زمانہ میں بھی مختلف گروہوں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ اس سے ناواقف نہیں ہوتے، ان کے زمانہ کے بھی رائج الوقت سکے ہوتے ہیں، وہ ایسا ایک سکہ بھی استعمال نہیں کرتے، صاف بات کہتے ہیں، اللہ پر ایمان لاؤ، اس کی صفات پر، اس کے افعال پر ایمان لاؤ، اس کے ملائکہ پر ایمان لاؤ، تقدیر پر ایمان لاؤ، حشر نشر، حیات بعد الموت پر ایمان لاؤ، اگر ایسا کرو گے تو تمہیں جنت ملے گی، ایک مرتبہ بھی نہیں کہتے کہ تمہیں حکومت ملے گی، ہمیشہ یہ کہتے ہیں، تمہیں جنت ملے گی، خدا کی رضا ملے گی، خدا تم سے راضی ہوگا، قرآن و حدیث میں مجھے کہیں نہیں ملتا کہ دین کی دعوت قبول کرنے سے تم کو دنیا میں علو و اقتدار حاصل ہوگا، اگر کہیں حکومت اور امن و حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے تو اس کا انداز یہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا	اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم میں سے
الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ	ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ انھیں ضرور
کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪	ملک کی حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے
وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی	پہلوں کو عطا کی تھی، اور ان کے لئے جس
لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ	دین کو پسند کیا ہے، اسے ضرور مستحکم کردے گا
اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ	اور البتہ ان کے خوف کو امن سے بدل
بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ	دے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥ میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے،

(النور-۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا وہ لوگ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ۔(الحج-۴۱) دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔

یعنی یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ جو ہے یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے اس کے راستہ سے حکومت الٰہی تک نہیں پہونچنا ہے، بلکہ حکومت الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھنا ہے، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے پھر ان کو رائج کرنا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے مقاصد، مبادی و حقائق اور عقائد کے بارے میں حد درجہ کے غیور بلکہ ذکی الحس ہوتے ہیں، اور اس میں ذرا سی بھی تبدیلی و تحریف گوارہ نہیں کرتے۔

جب مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اور آپ کی پوری نصرت کریں گے تو ہمیں ملے گا کیا؟ آپ کے لئے بڑا آسان تھا (اور اس کے قرائن موجود تھے) کہ اے بھائی ہم آجائیں گے اور تم ہمارے ساتھ مل جاؤ گے، تو بادشاہت قائم کرلیں گے ایک اسٹیٹ بن جائیگا، اس لئے کہ تم منتشر ہو، ہماری وجہ سے وحدت پیدا ہوجائیگی، تم کمزور ہو طاقت آئیگی، لیکن اس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

اس کی ایک مثال اور دیتا ہوں، جبلہ ابن ایہم ایک بڑا عرب سردار تھا، غسانی ریاست ملک شام میں ایک پورا اسٹیٹ تھا، ایسے ہی جیسے برطانوی عہد میں ہمارے یہاں حیدرآباد وغیرہ کی ریاستیں تھیں، وہ اسلام لایا تو ہزاروں اس کے ساتھ مسلمان ہوئے، مکہ آیا تو طواف کرنے لگا، ایک معمولی عرب بدو بھی طواف کررہے تھے، طواف میں اس کا شاہی لباس چادر لٹک رہی تھی

جیسا کہ بڑے آدمیوں کا دستور تھا، اس پر اس بدّو کا پاؤں پڑ گیا، چادر گر گئی تو اتنا جسم کا حصہ اس کا کھل گیا
اس نے اس بدّو کے ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ بدّو کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا' بدو کی یہ ہمت تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہیں
تھپڑ مارتا، اس نے حضرت عمر فاروق رضؓ امیر المؤمنین کے پاس شکایت کی اور کہا کہ جبلہ ابن ایہم
نے مجھے تھپڑ مارا ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قصاص ضروری ہے' لوگوں نے کہا کہ اس کا
تو مسلمان رہنا مشکل ہے' فرمایا کہ اس کی پروا نہیں! جبلہ نے کہا کہ میں تو ایسے دین میں نہیں رہ سکتا'
جہاں میری ایسی بے حرمتی ہو، وہ چلا گیا، لیکن حضرت عمر رضؓ کی پیشانی پر شکن بھی نہیں آئی جائے' وہ جانے
اس کا کام جانے، لیکن ہم حکم الٰہی کو نہیں بدلیں گے' حضرت اسامہؓ نے سفارش کی کہ فلاں
معزز قبیلہ کی عورت نے چوری کی ہے' اس پر یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حد جاری نہ ہو'
آپ نے فرمایا "لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا" اگر فاطمہ بنت محمد —
اعاذھا اللہ تعالیٰ — کا ہے کو ایسا ہوتا، کبھی نہ ہوتا — بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا'
فرمایا کہ اللہ کے حدود میں سفارش کرتے ہو؟ اور اتنا فرمایا کہ حضرت اسامہؓ دہل گئے' پھر کچھ نہ کہا اور حد جاری ہوئی۔

تو ایک بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دین کو اسی طرح پہونچاتے ہیں' انھیں اصطلاحات
کے ساتھ پہونچاتے ہیں، جو پیغمبروں کی دعوت اور آسمانی کتابوں میں آئے ہیں' بلکہ الفاظ تک کا تحفظ
کرتے ہیں' اور دین کی تعبیر ایسی نہیں کرتے کہ جس سے یہ خیال ہو کہ بہت سے لوگ تو پڑھے لکھے ہیں'
بہت ذہین ہیں، کھنچ کر چلے آئیں گے' بالکل جیسی چیز ان کو ملتی ہے ویسی ہی چیز ان کے سامنے
رکھ دیتے ہیں' لیکن حکمت کے ساتھ' ان کا عمل اس آیت پر ہوتا ہے :-

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی' اور
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ ۔ (النحل-۱۲۵)	عمدہ نصیحت سے بلاؤ۔

لیکن اس میں یہ خطرہ مول نہیں لیتے کہ ذہن ایک دوسرے رخ پر چلا جائے' یہ نبوی مزاج

ہے اور یہ دین جو اس وقت تک محفوظ رہا ہے، وہ خدا کے فضل کے بعد اسی وجہ سے ہے کہ امت کے ہر دور میں علمائے ربانی اس کی حفاظت کرتے رہے انھوں نے اس کی روح کی بھی حفاظت کی، مراتب کی بھی حفاظت کی کہ دین میں جس حکم، جس رکن کا جو مقام ہے وہ باقی رہے، جو چیز جس مقام کی ہے وہیں رکھی جائے، عبادت عبادت ہے، فرائض فرائض ہیں، ارکان ارکان ہیں، ایمانیات ایمانیات ہیں، آخرت آخرت ہے، انھوں نے دنیا کو آخرت پر غالب ہونے نہیں دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت میں بے عملی ہے، ہم سب بھی خطاکار اور کمزور مسلمان ہیں، لیکن یہ دین محفوظ ہے، آج تک دین میں تحریف نہیں ہو سکی، اس کے برخلاف عیسائی کلیسا کے ذمہ داروں اور بائبل کے شارحین نے اپنے زمانہ کے بعض جدید نظریات بائبل میں شامل کر لئے، بائبل میں شامل نہ ہو سکے تو اس کی شرح اور اس کی تفسیر میں ان کو شامل کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ نظریہ بدلا تو بائبل بھی متزلزل و مشکوک اور ساقط الاعتبار ہو گئی، بائبل کی تفسیر میں انھوں نے لکھ دیا کہ زمین چپٹی ہے، اس لئے کہ اگر چپٹی نہ ہو گول ہو تو خدا کا دیدار قیامت کے دن سب کو کیسے ہو گا؟ بائبل کی یہ تشریح غلط ثابت ہو گئی، اور زمین کی کرویت کا نظریہ تسلیم کر لیا گیا، بائبل پر بھی قدرتاً اس کا اثر پڑا، اس کی حقانیت پر، اس کے منزل من اللہ اور کلام الٰہی ہونے پر بھی اثر پڑا۔

"آخری بات عقیدۂ آخرت کا اہتمام ہے، وہ انبیائے کرام کی دعوت کا بنیادی نقطہ ہے، جو لوگ انبیائے کرام کے اقوال و احوال کے مطالعہ میں زندگی گذارتے ہیں، اور ان کے کلام کا صحیح ذوق رکھتے ہیں، وہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے ہوتی ہے، اور اس کی تصویر (نعمت و مصیبت، اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ) ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے، وہ ہمہ وقت

جنت کے شدید اشتیاق، اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں، یہ بات ان کے لئے بالکل مشاہدہ، اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کے شعور و احساس اعصاب اور قوت فکریہ پر غالب آجاتا ہے۔

آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات (جنہیں اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لئے مہیا کر رکھا ہے) اور تمام عذابوں (جو نافرمان کافروں کے لئے تیار کئے گئے ہیں) کا ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے ہونا، یہی انبیائے کرام کی دعوت اور ان کی پند و نصیحت کا اصل محرک تھے، یہی ان کو پریشان کرتا رہتا ہے، ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دیتا ہے، ان کی پرسکون و پاکیزہ زندگی کو مکدر کر دیتا ہے، اور ان کو کسی حالت میں سکون، اور کسی پہلو قرار نہیں ملتا، نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے شر و فساد، حالات کی ابتری، اور ماحول میں خرابیوں کے پروان چڑھنے کی صورت میں بھی (جس سے وہ سخت اذیت محسوس کرتے ہیں) ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز، اور ان کے لئے سب سے طاقتور محرک یہی فکر آخرت ہے، اور وہ اسی کو اپنی دعوت و تبلیغ کی اصل وجہ، اور خوف و اضطراب کا اصل سبب قرار دیتے ہیں۔"[1]

پھر وہی شروع کی بات میں عرض کرتا ہوں کہ یہ دین جو ہم کو ملا ہے، یہ دانشوروں سے نہیں ملا ہے، مصنفوں سے نہیں ملا، مفکّروں سے بھی نہیں ملا، سیاست دانوں سے بھی نہیں ملا، حکماء اور فلاسفہ سے بھی نہیں ملا، یہ ملا ہے پیغمبروں سے، اس لئے ہر بات میں ہمیں

---

[1] یہ ٹکڑا جو مقرر کی تقریر میں رہ گیا تھا، اس کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے بلند مقام حاملین" ص ۸۲-۸۴ سے اخذ کر کے تقریر میں برائے نام تبدیلی کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ تقریر اپنے موضوع پر جامع اور مکمل ہو جائے۔

یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس موقعہ پر پیغمبر ہوتا تو کیا کہتا، نبی ہوتا تو کس زبان میں بات کرتا، کس چیز کی دعوت دیتا، اس کی دعوت میں کس چیز کا تناسب کیا ہوتا، مجھے امید ہے کہ جو حضرات محض طالبِ حق محض طالبِ دین ہیں، وہ اسی کو معیار بنائیں گے، اور ہمیشہ اسی کو پیش نظر رکھیں گے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ	اور وہ لوگ جب انھیں ان کے رب کی
لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ۝	آیتوں سے سمجھایا جاتا ہے تو ان پر بہرے
(الفرقان۔۷۳)	اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں، اللہ تبارک وتعالےٰ ہمیں اور آپ کو سب کو توفیق دے اور ہمیں استقامت عطا فرمائے، اور ہم جب اس کے سامنے حاضر ہوں، تو ہم سرخرو ہوں، وہی آیت مبارکہ جس سے اس مجلس کا افتتاح کیا گیا ہمارے پیش نظر رہنی چاہیئے:۔

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ ج	جس دن بعضے منہ سفید، اور بعضے منہ
فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْہُہُمْ قف	سیاہ ہوں گے، سو وہ جن کے منہ سیاہ
اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ	ہوں گے، ان سے کہا جائیگا، تم ایمان
بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ	لاکر کافر ہو گئے تھے، اب اس کفر کے
ابْیَضَّتْ وُجُوْہُہُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ	بدلے میں عذاب چکھو، اور وہ لوگ
اللّٰہِ ط ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ۝	جن کے منہ سفید ہوں گے تو وہ اللہ
(آل عمران۔۱۰۶۔۱۰۷)	کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں
	ہمیشہ رہیں گے۔

اے اللہ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جن کے متعلق تو نے فرمایا ہے:۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ — اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے

فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط هُمْ فِيْهَا — تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ

خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران ۔ ۱۰۷) — اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایمان اور اس کی قیمت

[یہ تقریر تبتی مہاجرین کے ایک اجتماع میں ۳۱ر اکتوبر کو بعد نماز ظہر عیدگاہ میدان کی مسجد میں کی گئی۔[1]]

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ	توان کے پروردگار نے ان کی توبہ قبول کرلی
عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ	(اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا	عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا،
وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا	تم ایک دوسرے کی جنس ہو تو جو لوگ میرے
فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ	لئے وطن چھوڑ گئے، اور اپنے گھروں سے
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ	نکالے گئے، اور ستائے گئے، اور لڑے
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ	اور قتل کئے گئے، میں ان کے گناہ

[1] اس اجتماع کا انتظام واہتمام مولوی ولی اللہ شاہ مو ندوی، مولوی عصمت اللہ بابا ندوی اور حاجی محمد عثمان بٹ ندوی اور ان کے رفقاء واحباب نے کیا تھا، سری نگر میں تبتی مہاجرین کی ایک بڑی تعداد ہے، جو چینی قبضہ اور دین کے خطرہ میں پڑجانے کی وجہ سے ترک وطن کرکے کشمیر آگئے ہیں۔

عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ (آل عمران - ۱۹۵)

دور کر دوں گا، اور ان کو بہشتوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے یہاں بدلہ ہے، اور خدا کے یہاں اچھا بدلہ ہے۔

میرے عزیز بھائیو! مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں آج اپنے مہاجر بھائیوں سے ایک جگہ مل رہا ہوں، یہ ملاقات تمام سیاسی، معاشی، علمی اغراض و مفادات سے بالکل الگ ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت، اور اسلام کے رشتہ سے ہے، اور یہ موقعے قسمت سے نصیب ہوتے ہیں۔

بھائیو! وطن کیوں وطن ہوتا ہے، اور فارسی کے ایک شاعر نے کیوں کہا ہے؟ ؎

خاکِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر

خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر

وجہ یہ ہے کہ وطن مانوس چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، جن جن چیزوں سے آدمی کو اُنس ہوتا ہے، وہاں سب جمع ہوتی ہیں، وہاں اس کا بچپن گذرا ہوتا ہے، جوانی کے دن بیتے ہوتے ہیں، وہاں کی پیدائش ہوتی ہے، وہاں کی گلیوں میں وہ چلا پھرا ہوتا ہے، وہاں کے باغوں، اور وہاں کی گلیوں میں کھیلا ہوتا ہے، وہ وہاں کے ذرہ ذرہ پتے پتے کو پہچانتا ہے اور اس سے اس کو اُنس ہوتا ہے، اور پھر وہاں اس کے اسلاف دفن ہوتے ہیں، وطن اور پردیس میں یہی فرق ہے کہ وطن میں اسبابِ اُنس اور اُنس کے مرکز بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں، اس لئے حضرت بلالؓ جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے، وہاں ان کے محبوب بلکہ محبوب رب العالمین موجود تھے، اللہ نے ان کو ایسی عزت بخشی کہ ان کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اور آپ کی مسجد کا مؤذن بنا دیا، لیکن کبھی کبھی وہ بھی کہہ اٹھتے تھے ؎

اَلَا لَیتَ شعرِی ھل اَبیتَنّ لیلۃ

بواد وحولی اذخر وجلیل

(کیا کوئی ایسی رات بھی آئے گی کہ میں ایک ایسی وادی میں رہوں گا جہاں میرے گردو پیش مکہ کی گھاس پھوس ہوگی۔)

خود حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت میں مکہ سے چلتے وقت بیت اللہ کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا کہ میں کبھی تجھ کو نہ چھوڑتا لیکن یہاں کے لوگ مجھے نکالتے ہیں، اور یہاں دین پر قائم رہنا مشکل ہے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ کے بندوں نے دین کی خاطر ایسے عزیز وطن کو خیر باد کہا، بہت سے لوگوں نے عمر بھر کا جمع کیا ہوا سرمایہ، اور زندگی بھر کی پونجی چھوڑی، اور اپنے بال بچوں کو بھی خیر باد کہا، حضرت ابو سلمہؓ جب ہجرت کرنے کے لئے نکلے تو ان کے ساتھ ان کی رفیقۂ حیات تھیں (جو بعد میں امہات المومنین میں شامل ہوئیں) ام سلمہؓ کے قبیلۂ بنو المغیرہ نے حضرت ابو سلمہؓ کے اونٹ کی نکیل پکڑ کر کہا تم کہاں جا رہے ہو؟ تم نے اپنا دین بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے، لیکن ہماری بیٹی کو تم کیسے لے جا سکتے ہو، یہ تو ہماری بیٹی ہے انھوں نے کہا کہ اگر میں اس کو چھوڑ دوں تو تم لوگ مجھے جانے دو گے؟ انھوں نے کہا ہاں جانے دیں گے ابو سلمہؓ نے بیوی کو سلام کیا اور کہا خدا کے حفظ وامان میں تمہیں اور بچہ کو دیا، میں تو ایمان بچانے کے لئے جا رہا ہوں، مجھے ایمان تم سے زیادہ پیارا ہے، انھوں نے بھی خوشی کے ساتھ کہا خدا حافظ! اگر اللہ کو بلانا منظور ہے تو پھر ملیں گے، حضرت ام سلمہؓ کی گود میں بچہ تھا، ابو سلمہ کے قبیلہ بنو الاسد کے لوگ آگئے، انھوں نے کہا کہ ہم اپنے قبیلہ کے بچہ کو ماں کے پاس

رہنے نہیں دیں گے، انھوں نے اس معصوم کو اس زور سے چھینا کہ اس کا ہاتھ اتر گیا، اور وہ اس کو لے کر چلتے بنے، اس کے بعد ام سلمہؓ کا حال یہ تھا کہ جہاں سے ان کی جدائی ہوئی تھی، وہاں آکر اس واقعہ کو یاد کر کے روتی تھیں، اس پر ایک سال بیت گیا، آخر ان کے قبیلہ کے ایک شریف طبیعت آدمی کو ترس آیا اس نے کہا یہ بے زبان عورت یہاں آکر روتی ہے، آنسو بہاتی ہے، اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے، آخر یہ کیا ظلم ہے، یہ کیا سنگدلی ہے؟ ایک بھلا مانس اور خدا کا شریف بندہ[۱] تیار ہوا اور کہا، بہن ہم تمہیں مدینہ پہونچا دیں گے، بنو الاسد کو بھی رحم آیا اور بچہ کو ماں کے حوالہ کیا وہ کہتی تھیں کہ ایسا شریف آدمی تھا کہ مجھ کو کوئی ضرورت ہوتی تھی تو خود پہلے اتر جاتا تھا، اور الگ ہو جاتا تھا، اس نے راستہ بھر میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔[۲]

اس کے بعد پھر صہیب رومی کا واقعہ یاد کیجئے، وہ مکہ کے بہت بڑے کاریگر اور دستکار تھے، جب وہ چلنے لگے تو کفار نے آکر ان کا راستہ روک دیا، انھوں نے کہا صہیب تم کہاں جا رہے ہو؟ کہا کہ بھائی ہم دین و ایمان بچانے کے لئے جا رہے ہیں، جہاں اللہ کا نام آزادی کے ساتھ لے سکیں، وہاں ہم چلے جائیں گے، ان لوگوں نے کہا اچھا تم مدینہ جا سکتے ہو، لیکن تم نے ہمارے شہر میں رہ کر جو کمائی کی ہے، اس کو تمہیں لے جانے کا کیا حق ہے؟ یہ ہمارا مال ہے تم نے یہاں رہ کر حاصل کیا اور کمایا، اب تم تو جا رہے ہو تو جاؤ مگر ہم تم کو یہاں کا پیسہ لے جانے کی اجازت نہیں دیں گے، انھوں نے کہا تمہارا مال تم کو مبارک ہو، میں اپنی جھولی خالی کر کے سب تم کو دے جاؤں، تب تو تم خوش ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، کہا یہ لو لے جاؤ، تمام پونجی دے کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے، حضور صلے اللہ

---

[۱] عثمان بن طلحہ جو بعد میں بیت اللہ کے کلید بردار ہوئے [۲] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۷

علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، صہیب نے بڑی کمائی کی، وہ نقصان میں نہیں رہے۔[1]

آپ سب جانتے ہیں کہ دین وایمان کے لئے پہلے لوگوں نے جان دی، جان سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں، اس کے بعد وطن چھوڑا، دولت چھوڑی، اور بہت سے لوگوں نے حکومت بھی چھوڑی ہے، ایسے اللہ کے بندے بھی گزرے ہیں، جو ولی عہد تھے، شہزادہ تھے، ان کو امارت وریاست حاصل تھی، لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس میں بہت سے غلط کام کرنے پڑتے ہیں، ہمیں آخرت کی جو تیاری کرنی چاہیئے، وہ تیاری یہاں رہ کر نہیں ہوسکتی، حضرت ابراہیم بن ادھم کا نام آپ نے سنا ہوگا، وہ بھی ایسے ہی تھے، اور کئی ایسے بزرگ تھے، رکن الدین علاء الدولہ سمنانی، سید اشرف جہانگیر سمنانی بھی ایران میں امارت وریاست کے مالک تھے، اور اس کو لات مار کر آئے، اور راہِ خدا میں نکل کھڑے ہوئے، اور کہا ہم معرفت حاصل کریں گے، اور اس کی رضا کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

بھائیو! آپ لوگوں نے اپنا وطن چھوڑا آپ کو مبارک ہو، اللہ تعالےٰ اصل میں یہ دیکھتا ہے کہ میرے بندے نے کس چیز کو کس چیز کے لئے چھوڑا ہے، چیزوں کو چھوڑنے والے تو دنیا میں بہت ہیں، ہم آپ صبح شام روزانہ اخذ وترک کا یہ عمل کرتے رہتے ہیں، مثلاً آپ بازار گئے، آپ نے کوئی سودا خریدا، آپ نے کچھ پیسے چھوڑے، لیکن آپ نے کچھ پیسے دیئے ترکاری لی، آپ نے دام دیئے کپڑا خریدا، دفتر جاکر کوئی کام کرایا، یہ چھوڑنے اور لینے کا معاملہ تو انسان کی زندگی میں صبح شام ہوتا رہتا ہے، لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کس کو چھوڑا اور کس کے لئے چھوڑا؟ اللہ تعالےٰ اس کو دیکھتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲۳

اپنی بیوی ہاجرۃ اور اپنے شیرخوار بچہ اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑ کر چلنے لگے، حضرت ہاجرۃ نے کہا ہم کو کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ کہا اللہ نے حکم دیا ہے، حضرت ہاجرہ نے کہا کہ پھر ہمیں کوئی فکر نہیں، اگر اللہ کے حکم سے ہم کو چھوڑ کر جا رہے ہیں تو ہمیں کوئی ڈر نہیں ہے، دیکھئے اللہ نے اس عمل کو کیسا قبول کیا کہ ساری دنیا وہیں جاتی ہے اور کتنے شوق سے جاتی ہے اُڑ کر جانا چاہتی ہے، چاہتی ہے کہ پر لگ جائیں اور ہم وہاں پہونچ جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا وطن چھوڑ کر حضرت ہاجرہ کو وہاں لے گئے تھے، تو اللہ تعالیٰ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو وہاں لے جاتا ہے اور وہاں دوڑاتا ہے، پھراتا ہے، حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ تک، اور مروہ سے صفا تک دوڑی تھیں، تو اللہ تعالیٰ بڑے بڑے سلطان وقت، اور امام عصر کو بھی وہاں دوڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاجرۃ کی یہ ادا ہمیں پسند آئی، اس لئے تم بھی اسی طرح وہاں دوڑو، جہاں وہ تیز چلنے لگی تھیں، وہاں حکم ہوا کہ تیز چلو، جہاں وہ آہستہ چلیں تمہیں وہاں حکم ہوا کہ آہستہ چلو، آپ میں سے جو لوگ وہاں گئے ہیں، وہ یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بھائیو! دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ کیا چیز چھوڑی اور کس کے لئے چھوڑی؟ کیا چھوڑا کی اہمیت تو ایسی نہیں ہے، لیکن کس کے لئے چھوڑا اس کی اہمیت بہت ہے، میری محبت میں چھوڑا، میرے نام پر چھوڑا، اللہ کو اس پر پیار آتا ہے، اگر سلطنت چھوڑی لیکن کسی اور مقصد کے لئے چھوڑی تو اللہ کے یہاں اس کی قدر نہیں، اگر پیسہ چھوڑا لیکن اللہ کے نام پر چھوڑا، اور اللہ کی محبت میں چھوڑا، تو اللہ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے تو اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ آپ نے اپنا وطن کس چیز کے لئے چھوڑا؟ ہم کو جہاں تک معلوم ہے آپ نے اپنا ایمان بچانے کے لئے چھوڑا، اور ایمان ایسی چیز ہے کہ آدمی کو دور سے بھی دھوکا ہو کہ ایمان

کے لئے خطرہ ہے تو وہ چیخ مار کر رونے لگے، حدیث میں آتا ہے کہ تین باتیں وہ ہیں کہ اگر آدمی ان کو جمع کرلے تو اس نے ایمان کی صفات کو جمع کرلیا، اس میں سے ایک یہ ہے "من یکرہ أن یعود إلی الکفر کما یکرہ أن یقذف فی النار" اس تصور سے کہ میں کفر کی طرف لوٹ جاؤں، اسے ایسی وحشت ہو کہ جیسے اس کو آگ میں ڈالے جانے پر وحشت ہوتی ہے۔

ٹورنٹو، کناڈا میں میری ایک تقریر ہندوستانی، پاکستانی مسلمانوں کے اور عربوں کے اجتماع میں ہوئی تھی[1]، میں نے اس میں کہا، دیکھو بھائیو! اگر تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آئندہ ہماری نسل کا اسلام پر باقی رہنا مشکوک ہے، اور اس کا ایمان خطرہ میں ہے تو میں تم کو فتویٰ دیتا ہوں کہ چاہے تم کو اپنے وطن تک بیدل جانا پڑے تم کو یہاں سے چلا جانا چاہیے، ساری ملازمتیں، عہدے اور ساری ترقیاں چھوڑ کر تم کسی اسلامی ملک کی طرف کوچ کرو اور چلے جاؤ، ہم تو مسلمان ہیں، جیسے ہمارے عزیز نے بیان کیا لیکن آئندہ نسلوں کے بارے میں اطمینان نہیں، ہمارے بیٹے، پوتے بھی اسلام پر قائم رہیں گے یا نہیں؟ اب اگر تم کو خطرہ ہو کہ تمہاری اولاد، اور تمہاری اولاد کی اولاد خدانخواستہ ارتداد میں مبتلا ہو جائیں گی تو تمہارے لئے وہاں رہنا حرام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي	جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں،
أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ	جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے
قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ	ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال
فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ	میں تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز
أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً	و ناتواں تھے، فرشتے کہتے ہیں کیا خدا کا

[1] یہ تقریر مجموعہ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں" شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ صـ ۹۲ـ۱۰۰

فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ ملک فراخ نہیں تھا؟ کہ تم اس میں ہجرت
(النساء-۹۷) کر جاتے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (النساء-۹۷) ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری اس بات کو انھوں نے آج تک یاد رکھا ہے، وہاں سے جو لوگ آتے ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کی وہ تقریر ہمارے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے، کسی نے سنایا کہ جنوبی افریقہ میں ہم موٹر پر جا رہے تھے، لوگوں نے ریکارڈ چالو کر دیا، ٹیپ پر آپ کی آواز تھی، اور آپ کہہ رہے تھے کہ "اگر یہاں تمہاری اولاد کا اور آئندہ نسل کا اسلام پر قائم رہنا مشکل ہو تو تمہارے لئے اس سرزمین پر رہنا ایک دن بھی جائز نہیں، چاہے تم پر آسمان سے سونا برسے، چاہے زمین سونا اگلے"۔

اللہ تعالیٰ تمہارے ان بزرگوں کو اگر وہ دنیا میں نہیں ہیں تو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، اور اگر زندہ سلامت ہیں، تو اللہ ان کی زندگی میں برکت دے، مجھے یقین ہے کہ انھوں نے تمہارے ایمان بچانے کے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے، اللہ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہجرت کے عمل کو ایسا قبول کیا کہ اس کے نام سے مستقل جنتری (تقویم) قائم فرما دی، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ کل ۱۴۰۲ھ کا پہلا دن تھا، اس سال کا پہلا دن ہمیں مہاجرین کے درمیان نصیب ہوا، جو ہجرت سے شروع ہوتا تھا، میرا یہ مشورہ دینے کا جی چاہتا ہے کہ ایک "وصلی" بنائیے اردو یا تبتی رسم الخط میں اس پر خوش خط حروف سے لکھیں "ہم نے وطن کیوں چھوڑا؟" ہم نے تبت کو کیوں خیرباد کہا؟

ایک سوالیہ نشان، تو جس شخص کی نظر اس پر پڑے گی وہ یاد کرے گا کہ ہمارا وطن ہم کو کاٹ نہیں رہا تھا، ہمارا وطن ایسا بُرا بھی نہیں تھا کہ وہاں رہنا دوبھر ہو، ہم نے وطن چھوڑا ایمان کی خاطر، سوالیہ نشان اس کے دل میں چبھے، اور اس سے پوچھے کہ تم نے وطن کیوں چھوڑا تھا؟ اس کا جواب دل و دماغ دیں کہ ہم نے ہجرت کی تھی، اپنا اور اپنے بچوں، عورتوں بیٹیوں، پوتوں، نواسوں، پوتیوں اور ان کی اولاد کا ایمان بچانے کے لئے، آپ یہ کبھی نہ بھولیں، ورنہ تھوڑے دنوں کے بعد لوگ بھول جاتے ہیں، بہت سے بھول گئے کہ ہمارے آباء و اجداد یہاں کیوں آئے تھے، ان کو کیا مجبوری پیش آئی تھی؟ پھر سب ایک ہی رنگ میں رنگ جاتے ہیں، کھانے کمانے میں لگ جاتے ہیں، پھر نمازیں بھی چھوٹ جاتی ہیں، اور دینی تعلیم کا بھی سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، خدا کی یاد بھی فراموش ہو جاتی ہے، وہاں کے نظام میں ڈھلے ڈھلائے پرزوں کی طرح فٹ ہو جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ کوئی بات ایسی کیجئے کہ آپ ہمیشہ چونکتے رہیں اس کو دیکھ کر، وہ چیز آپ کو کاٹتی رہے، اور آپ کو غافل نہ ہونے دے، یا یہ کہ آپ وقتاً فوقتاً اجتماع کیجئے اس میں یہ بات یاد دلائیے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہی ایک طریقہ ہے کہ کوئی چیز لکھ کر لگا دیں کچھ دنوں کے بعد اس کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر ایک اور چیز چاہئے، پھر وہ بھی مانوس ہو جاتی ہے، پھر اس کے لئے کوئی تیسری چیز چاہئے، آپ دیوار پر چاہے نہ لکھئے اپنے دل پر لکھئے کہ ہم نے تبت کیوں چھوڑا تھا؟ ہم نے اپنا محبوب اور عزیز وطن کیوں چھوڑا تھا؟ سب کچھ برداشت کیجئے، اپنے ایمان کا نقصان برداشت نہ کیجئے جس کے لئے آپ نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ	جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے، یا دل سے
قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ	متوجہ ہو کر سنتا ہے، اس کے لئے اس میں
(قٓ ـ ۳۷)	نصیحت ہے۔

دعوت اور حکمتِ دعوت

[یہ تقریر ۲ رنومبر ۱۹۸۱ئہ مطابق ۴ر محرم الحرام ۱۴۰۲ھ بوقت صبح دس بجے جمعیۃ اہل حدیث جموں وکشمیر کے صدر دفتر ہال میں کی گئی، حاضرین میں ایک بڑی تعداد علماء، اساتذہ اور اہلِ علم وفکر کی تھی۔]

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○

(النحل - ۱۲۵)

آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقہ سے بیشک آپ کا پروردگار (ہی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔

حضرات! اللہ رب العزت کا یہ خطاب اپنے آخری نبی (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آخری امت کے لئے ہے کیونکہ اس امت کے بعد اور کوئی امت نہیں، یہ سورہ نحل کے

آخری رکوع کی آیت ہے جس میں دعوت و ارشاد کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ ۔ آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم و حکمت

وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ ۔ (النحل ۔ ۱۲۵) اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلایئے۔

حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقعہ پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے، اور حکمت و موعظت الگ ہے۔

اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندہ موسیٰ علیہ السلام کو اُس عہد کے خدا کے مغضوب ترین بندہ ظالم و جفا کار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔ (طٰہٰ ۔ ۴۳)

اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟

فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا ۔ (طٰہٰ ۔ ۴۴) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو:۔

لَعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ۝ شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کرے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔ (طٰہٰ ۔ ۴۴)

تاکہ وہ نصیحت پکڑے، یا سلیقہ کی بات سن کر اس کے دل میں خشیت و خوف پیدا ہو جائے اور اپنے کفر و طغیان، اور شر و ظلم سے باز آئے، اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہو تو وہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا، شاعر نے سچ کہا ہے۔ ع

کہتے ہیں وہ بھلے کی ولیکن بُری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسن سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال وجواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہیئے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقعہ پر بھی اس کی ہدایت ہوئی:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط	اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے
(النحل۔۱۲۵)	بحث کیجئے۔

تاکہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقۂ استدلال سے متاثر ہوں، چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقۂ بحث ومجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بناء پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین وسامعین پر حسن مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت آیت:۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا	بیشک ابراہیم بڑے مقتدا تھے اللہ تعالیٰ
لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ط وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ	کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف
(النحل۔۱۲۰)	کے ہو رہے تھے اور وہ شرک کرنے
	والوں میں نہ تھے۔

سے بھی واضح ہوتی ہے، ان کو اس طریقۂ استدلال، سلیقہ، حکمت وموعظت، اور احسن مجادلہ کے باوجود:۔

حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ط وَمَا کَانَ مِنَ	طریق مستقیم والے (یعنی) صاحبِ اسلام
الْمُشْرِكِیْنَ ٥ (آل عمران۔۶۷)	تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔

کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کی دعوت میں حکمت تھی، مداہنت نہ تھی، لینت تھی، سیاست نہ تھی، لہذا ایک مومن مسلمان کو بھی یہ طرز تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے،

عقائد کی اصلاح کے لئے بھی "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ" کا طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ مریض کا علاج کرنا ہے، اس میں پیار، نرمی، اور محبت ہو، سختی، درشتی، تیزی و تندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج معالجہ کی بات ہی الگ ہے۔ امت کو پیغام ملتا ہے:۔

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۝ (التوبہ۔۱۲۸)	(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (البشر) سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے جو تمہارے منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

اس پر عمل کرنا آپ کے ایک امتی پر بھی لازم ہے، وہ دوسرے انسان کو حکمت عملی اور محبت اور پیار سے دعوت دے کر سلیقہ سے سمجھا کر عقائد کی اصلاح کے لئے مائل و راغب کرے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکر تبلیغ اور دل سوزی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ	(اے پیغمبر!) تمہاری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے

اَسَفًا ۝ پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دو (حالانکہ یہ ماننے والے نہیں)۔ (الکہف - ۶)

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء - ۳) کیا آپ اپنی ذات کو ان کے ایمان لانے کی خاطر ہلاکت میں ڈال دیں گے؟

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، اور درد دلی تھا کہ ایک ایک آدمی اپنے مالک مختار کے آستانہ پر سر جھکائے، اور کوئی اس در سے محروم نہ جائے، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ :-

لان یھدی اللہ بک رجلا خیر لک من حمر النعم۔ سرخ اونٹوں[1] سے بھی کہیں بہتر ہے کہ ایک آدمی کو تمہارے ذریعہ سے ہدایت ہوجائے

مبلّغ کو بھی ایک دردمند اور دانشمند ڈاکٹر اور معالج کی طرح مریض کا خیر اندیش بن کر علاج کرنا ہے، حکیم یا ڈاکٹر کا مقصد مریض کو مارنا نہ ہو بلکہ صحت یاب کرنا ہونا چاہیئے، عقیدۂ توحید کی بات تو بالکل صاف کہی جائے، اور شرک کی تردید بھی ہو، لیکن دوا کی مناسب خوراک ہو، اگر دوا زیادہ تیز یا مقدار میں زیادہ ہوگی یا یکدم کھلا دی جائے گی، یا قوت برداشت سے زیادہ ہوگی تو مریض کا کام تمام ہو جائے گا، چونکہ بات واقعات سے مربوط ہو کر زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے، اس لئے دو ایک واقعات سنئے :-

دیکھئے اللہ کے بندے جن کے دلوں میں عشق الٰہی کی آگ لگی تھی، وہ بھی حکمت سے کس طرح کام کرتے رہے ہیں، شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے، تاتاریوں نے اسلامی سلطنتوں کو تاراج کیا تھا، اتفاق سے اسی روز ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور

[1] سرخ اونٹ عرب میں بڑی دولت اور نایاب چیز سمجھی جاتی تھی۔

شکار کھیلنے نکلا ہوا تھا، اور یہ تاتاری شہزادہ چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، جو ایران پر حکومت کر رہی تھی، شہزادہ کی شکارگاہ میں جب شیخ جمال الدین اتفاقاً داخل ہو گئے اور پہرہ دار ان کو پکڑ کر شہزادہ کے سامنے لائے تو شہزادہ نے ایک مسلمان فقیر صورت دیکھ کر اور وہ بھی ایرانی کو دیکھ کر (جس کو تاتاری اس وقت بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے) بدشگونی لی، اور غصہ سے پوچھا، بتاؤ میرا یہ کتا اچھا ہے، یا تم؟ شہزادہ نے غیظ و غضب سے بات کی تھی، شیخ جمال الدین نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا، انھوں نے فرمایا: اس کا قطعی فیصلہ کرنے کا یہ موقعہ نہیں، شہزادہ بولا پھر اس کا کونسا موقعہ ہوگا؟ فرمایا وہ میرے خاتمہ یعنی وفات کے وقت ہی واضح ہوگا، اگر میں کائنات کے پیدا کرنے والے مالک و خدا لاشریک کی صحیح معرفت اور اقرار پر فوت ہوا تو میں آپ کے کتے سے بہتر ثابت ہوں گا، بصورت دیگر یہ کتا ہی مجھ سے بہتر اور خوش قسمت ہوگا، ان کے اس جواب نے شہزادہ کے دل پر ایک چوٹ لگائی، شہزادہ نے شیخ سے کہا، جب تم سنو کہ میں تخت نشین ہوا ہوں تو اس وقت مجھ سے آکر ملنا، شیخ جمال الدین کا شہزادہ کی ولی عہدی ہی کے زمانہ میں دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آگیا، آپ نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا کہ میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں، جو کام میرے ذمہ تھا، وہ ادھورا رہا شاید تم اس کو پورا کر سکو، اور یہ تمام واقعہ بیان کیا۔

شیخ جمال الدین کی وفات کے بعد جب ولی عہد کی تاج پوشی ہوئی تو پھر شیخ کے فرزند اپنے والد بزرگوار کی وصیت پورا کرنے کی خاطر روانہ ہوئے، شاہی محل کے دروازہ پر سپاہیوں نے ٹوکا اور دروازہ سے ہٹایا، آپ نے ایک درخت کے نیچے مصلی بچھایا، اور علی الصباح اذان دی، جس سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی، تحقیقات پر معلوم ہوا کہ کوئی مسکین صورت آدمی باہر بیٹھا ہے، اس نے ہی یہ آواز لگائی ہے، جس سے بادشاہ کی

نیند میں خلل پڑا، بادشاہ نے غصہ ہو کر اس کو گرفتار کر کے لانے کا حکم صادر کیا، چنانچہ ان کو پکڑ کر سپاہی بادشاہ کے پاس لائے، پوچھنے پر انھوں نے اپنے والد کا سلام پہونچا کر بتایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا، اور اس سوال کا جواب مل گیا، جو آپ نے کیا تھا، اور شکار کا واقعہ جو ولی عہدی کے زمانہ میں پیش آیا تھا یاد دلایا، بادشاہ کے دل پر اب دوسرا چرکا لگا، اور فوراً اپنے اسلام لانے کا اقرار کر کے اپنے وزیر سلطنت کو بلایا، اور اسے یہ قصہ کہا، وزیر نے جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی مسلمان ہو چکا ہوں، مگر میں نے اس کو پوشیدہ رکھا تھا، اس طرح ایران کی یہ چغتائی تاتاری شاخ تمام اہل کاروں، فوج سمیت حلقہ بگوش اسلام ہوئی[1]، اس طرح ایک اللہ والے نے ایرانی تاتاری سلطنت میں اسلام کو کیسے پھیلایا کہ ساری کی ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔

ایسے ہی ایک دوسرا واقعہ ہے کہ مولانا یحییٰ علی صاحب جو حضرت مولانا ولایت علی صاحب صادقپوری[2] کے تربیت یافتہ تھے، اور ان کو مجاہدین سرحد کی مدد کرنے کے الزام میں (جنھوں نے حضرت سید صاحب کے بعد ان کا کام جاری رکھا تھا) ۱۸۶۴ء میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی، وہ انبالہ جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں محبوس تھے جس میں ہوا اور روشنی کے لئے کوئی راستہ نہ تھا، سخت گرمی کے دن تھے، جیل افیسر معائنہ کے لئے آیا تو اس کو خیال ہوا کہ ایسے حال میں تو یہ مر جائیں گے، مقدمہ ابھی باقی ہے، اس نے حکم دیا کہ دروازہ کھلا رہے، اور سنتری پہرہ پر کھڑے رہیں، یہ سنتری بالعموم سکھ یا گورکھا ہوتے تھے،

---

[1] اس واقعہ کو ایرانی مورخین اور پروفیسر ارنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) "دعوت اسلام" میں الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ بیان کیا ہے، مقرر نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد اول میں اس کو نقل کیا ہے نیز ملاحظہ ہو "تاریخ رشیدی" از مرزا محمد حیدر

[2] مولانا ولایت علی صاحب حضرت سید احمد شہید کے خلفائے کبار میں تھے۔

وہ جہاں اپنی ڈیوٹی سنبھالتے، آپ ان کو مخاطب کر کے حضرت یوسفؑ کا وعظ توحید سنانے لگتے:۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف - ۳۹ - ۴۰)

اے قید خانہ کے رفیقو! متفرق معبود اچھے یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو، جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں، (اور) حکم دینے کا اختیار (صرف) خدا ہی کا ہے (اور) اس نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی (توحید) کا سیدھا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وہ ان آیات کی تلاوت اور تشریح فرماتے یہ سن کر ان پہرہ داروں کے آنسو نکل پڑتے اور ان پر سناٹا چھا جاتا، اور جب ان کا پہرہ بدلا جاتا تو وہ خوشامد کرتے کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنے بندگان خدا کے دل میں توحید کا بیج پڑ گیا اور ان کو ایمان نصیب ہوا۔

اسی طرح مولوی محمد جعفر صاحب کو جب "کالا پانی" کی سزا ہوئی تو کوئی غم، فکر ان کے چہرہ پر نمودار نہ تھا، انگریز تماشائیوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انھوں نے فرمایا، یہ موت نہیں شہادت ہے، جو ایک ایسی نعمت ہے، جس کے مقابلہ میں تمام دنیا کی سلطنت ہیچ ہے، وہاں بھی وہ تبلیغ دین حکمت سے انجام دیتے رہے جیل اور پورٹ بلیر میں بھی وہ اور ان کے رفقائے کرام توحید کی دعوت اور تبلیغ کرتے رہے، اور بہت سے بندگانِ خدا نے ہدایت پائی، مولانا یحییٰ علی صاحبؒ کے پاس ایک رات ایک بدکردار، بدنام قیدی کا بستر آگیا، جب اس نے مولانا کی عبادت گذاری، اور دعائیں، اور آہ وزاری دیکھی تو وہ بھی تائب ہوا، اور تہجد گذار بن گیا، اسی طرح جیل میں بیسیوں بندگانِ خدا کو ہدایت ہوئی اور ان کی زندگی بدل گئی۔

اس طرح اللہ کے بندوں میں جب دل کا سوز، اور دماغ کی روشنی ہو، اور دونوں مل کر کام کریں تو پھر نتیجہ واضح ہے، اگر ایک شکاری جانور کو شکار کرنے کے لئے حکمت استعمال کرتا ہے، تو ایک مبلغ اپنے مقدس کام میں حکمت سے کام کیوں نہ لے جو اس سے بہتر مقصد رکھتا ہے، شرک سب سے بڑا مہلک مرض ہے، اس کا علاج بھی حکمت سے کرنا لازم ہے، لہجہ نرم ہو مگر بات سچی ہو، تاکہ سننے والا مانوس ہو تو علاج کا اثر جلد ہوگا، شرک ہی کے متعلق اعلان ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط (النساء-۱۱۶)	بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دے گا۔

توہم پرستی اور مخلوق پرستی سے نکالنے کے لئے جتنی نرمی برتی جائے، مناسب ہے، ایک پورے شہر پورے ملک کو حکمت ہی سے خدا کے صحیح راستہ پر لایا جاسکتا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن جب سنا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا:۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحلّ الکعبۃ الیوم اذلّ اللہ قریشا۔ آج رن کا دن ہے، آج کعبہ میں آزادی کے ساتھ عمل کیا جائے گا، آج اللہ نے قریش کو ذلیل کیا ہے۔

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بدلے "الیوم یوم المرحمۃ الیوم یعز اللہ قریشا ویعظم اللہ الکعبۃ[۱]" (آج رحمت عام کا دن ہے، آج اللہ قریش کو عزت دے گا، آج کعبہ کی عزت بڑھائی جائیگی) کا اعلان فرمایا، اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دیا، جھنڈا پکڑنے میں باپ کی جگہ بیٹے کا ہاتھ آیا، تو اس حکمت عملی نے ابوسفیان کے دل میں تلاطم پیدا کر دیا، آپ نے ان کے گھر کو جب دارالامان کا درجہ دیا، تو ابوسفیان کی دشمنی محبت اور دوستی سے بدل گئی، اب حکمت کا اندازہ کر لیجئے، ابوسفیان کو جو یہ اعزاز بخشا گیا، تو ان کی نفرت کی آگ ٹھنڈی ہوئی، اور دل کے دروازے کھلے، تاریخ و تذکرہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ ہمارے بزرگ جس راستہ سے گذرے توحید کی تبلیغ اور بدعات و شرکیات سے پرہیز کا وعظ کہتے ہوئے گزرے، جو بھی قافلہ ہمارا جہاں سے گذرا وہاں توحید کی ہوا چلی، حضرت سید علی ہمدانی، سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالےٰ کشمیر کی گل پوش و گل پاش وادی یا چشموں کی سیرابی کا نظارہ کرنے نہیں آئے، بلکہ کوہستانوں،

---

[۱] ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص۷

لق و دق بیابانوں، خارزار وادیوں کو قطع کر کے کلمۂ حق کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر آئے، جس کے نتیجہ میں آپ کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو توحید کا حلقہ بگوش پاتے ہیں، میں نے یہی بات ذرا تفصیل سے جامع مسجد کی تقریر میں کہی تھی، اخباروں میں شایع ہوا کہ میں نے سارے کشمیریوں کو مشرک بنایا، بھلا مجھے بلا تحقیق اس کا کیا حق تھا، اور میں مسلمانوں کو بیک زبان کیسے کافر کہہ سکتا ہوں، میری پوری تقریر اس مجموعہ میں شامل ہے۔

توحید کی دعوت میں اُنس پیدا کیا جائے، اختلافی مسائل کو درمیان میں نہ لایا جائے اختلافی مسائل میں ترجیح الگ بات ہے، علمی اختلاف کی گنجائش بہرحال ہے، وہ بعد میں ہوگا، پہلے توحید کا مضمون لانا ہے، آستانۂ الٰہی پر سر جھکانا ہے، علمی اختلاف کا موقع اس کے بعد ہے، بزرگوں کا کام توحید پھیلانا اور شرک و بدعت کو دور کرنا ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے جو مسلک حنفی پر عمل کرتے تھے، ایک اہل حدیث عالم ان کے مرید ہوئے اور رفع یدین چھوڑ دی، مولانا کو خبر ہوئی تو فرمایا، اگر آپ کی تحقیق رفع یدین سے متعلق بدل گئی ہے تو الگ بات ہے، لیکن اگر میری وجہ سے چھوڑ دی ہے، تو میں سنت چھوڑنے کے لئے نہیں کہہ سکتا ہوں۔

آپ کو دیکھنا ہے کہ اللہ کی مخلوق کہاں جا رہی ہے؟ اور سب سے بڑی بات قرآن و حدیث کی تبلیغ ہے، یہی چیز دعوت و تبلیغ کی اصل و اساس ہونی چاہیئے، مسلکی خصوصیات اس کے بعد آتے ہیں، مسلمان تعداد میں بہت بڑھ گئے ہیں لیکن جذبۂ دین وہ نہ رہا جو پہلے تھا، عامۃ المسلمین کے لئے کوئی خطرہ ہو تو اس کے لئے سب سینہ سپر ہو جائیں، اس بات کا خیال رہے کہ کسی کی دل آزاری نہ کی جائے، ہمیشہ وسعت قلبی کا ثبوت دیا جائے، نفرت نہ پھیلائی جائے۔

صادقپوری اور غزنوی خاندان کے حضرات اہل حدیث علماء تھے، ان میں مولانا ولایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا یحیٰی علی، مولانا عبد الرحیم، مولانا سید عبد اللہ غزنوی، مولانا عبد الجبار غزنوی جیسی دیندار اور خدا دوست ہستیاں تھیں، کہ ان کے چہروں سے نور ٹپکتا تھا، اور ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، انھوں نے ہندوستان بھر میں کس طرح موعظت وحکمت یا بضرورت استدلال واثبات سے لوگوں کے عقائد کی تصحیح کی۔

امرتسر میں ندوہ کا جلسہ تھا جس میں ہندوستان کے چوٹی کے علماء شریک تھے، علامہ شبلیؒ کا زمانہ تھا، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کی زبانی میں نے سنا ہے کہ صبح مولانا عبد الجبار صاحب غزنوی کا درس قرآن ہوتا تھا، غالباً فارسی میں درس دیتے تھے، مولانا شبلی ایک مرتبہ شریک ہوئے تو مولانا شروانی سے کہا، جس وقت مولانا عبد الجبار صاحب اللہ کا نام لیتے تھے تو روح وجسم میں ایک بجلی سی دوڑ جاتی تھی، اور دل چاہتا تھا، کہ سر ان کے قدموں پر رکھ دیا جائے۔

ہندوستان پر خدا کی ایک بڑی رحمت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان تھا، جس نے قرآن وسنت کو رواج دیا، اور شرک وبدعت کا قلع قمع کیا، ترجمۂ قرآن کرنے پر ان کی سخت مخالفت کی گئی، مگر وہ اللہ کے بندے کب دعوت دین سے ہچکچانے والے تھے؟ اس خاندان میں شاہ عبد العزیزؒ، شاہ عبد القادرؒ، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل، شاہ اسحاق جیسے علمائے ربانیین اور مجاہدین پیدا ہوئے۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ کے صرف ایک وعظ سے ایک جلسہ میں بیسیوں طوائف اور پیشہ ور عورتیں نیکوکار اور پارسا بن گئیں، تفصیل میری کتاب "کاروان ایمان وعزیمت" میں دیکھئے۔

تقریر کے اختتام پر جمیعۃ کے ناظم تبلیغ صوفی محمد مسلم صاحب نے اقبال کا یہ شعر پڑھا اسما پر یہ تقریر ختم کی جاتی ہے کہ اس میں تقریر کی روح آگئی ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر، میر کارواں کے لئے

نصرت الٰہی کے شرائط اور نصرتِ اسلام کا سیدھا راستہ

[یہ تقریر انجمن نصرۃ الاسلام ہال میں ۴ ؍ نومبر ۱۹۸۱ء بروز چہار شنبہ ۴ بجے سہ پہر کو کی گئی، جہاں مقرر کے اعزاز اور وداع کی تقریب میں ایک عظیم جلسہ ہوا جس میں سری نگر اور اطراف کے علماء و اہل علم و فکر خاصی تعداد میں شریک تھے۔]

حمد و صلوٰۃ و خطبۂ مسنونہ کے بعد!

جناب صدر انجمن و صدر اجلاس، علمائے کرام، معززین شہر اور برادرانِ عزیز! آج ایک ہفتہ کے قیام سری نگر کا اختتام اس جلسہ پر ہو رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض اتفاق نہیں، حسن اتفاق ہے، میں دنیا کے بیشتر مشہور ممالک میں جا چکا ہوں، لیکن ایسا بدقسمت مسافر ہوں، جس پر اقبال کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔ ع

تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

میں اسلامی ممالک میں جہاں جہاں گیا، وہاں سے بجائے مسرتیں لے کر اور مطمئن ہو کر آنے کے، فکر لے کر آیا، میرے نصیب میں یہی ہے، معلوم نہیں یہ میری بڑھی ہوئی ذکاوتِ حس کی بناء پر ہے یا اس لئے کہ جہاں جاتا ہوں، وہاں اپنا تاریخی مطالعہ فراموش نہیں کر پاتا، جو واقعات تاریخ اسلام میں پیش آئے، وہ میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں، اور ان سے

جو نتائج نکالے جا سکتے ہیں، میرا دماغ ان سے آزاد نہیں ہونے پاتا، خود قرآن مجید نے اس کی مذمت کی ہے، کہ آدمی آنکھوں سے سب کچھ دیکھے، لیکن کسی چیز سے سبق نہ لے:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ — کتنی نشانیاں زمین و آسمان میں ایسی ہیں

وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا — جن پر سے لوگ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں اور

مُعْرِضُوْنَ ۝ (یوسف ـ ۱۰۵) — کچھ سبق نہیں لیتے۔

میں اپنے کو بہت خوش نصیب سمجھتا، اگر آپ کو پیام تہنیت دے جاتا، اور آپ کے اطمینان و سکون میں کچھ اضافہ کرتا، خدا نے آپ کو جو حسین سرزمین عطا فرمائی ہے، جن نعمتوں کی بارش کی ہے، جو قدرتی مناظر آپ کو یہاں عطا کئے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر میں آپ سے کہتا کہ آپ کو یہ سب مبارک ہو آپ مطمئن رہیں، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے، اور اس کا بڑا سبب میرا قرآن مجید کا ٹوٹا پھوٹا مطالعہ ہے، میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب، اور ایک بولتا ہوا مرقع یا آئینہ ہے جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں، اور قوموں سلطنتوں تمدنوں کی ترقیات و عروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں، اللہ تعالے فرماتا ہے:۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ — ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ — جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے تم اس پر غور

(الانبیاء ـ ۱۰) — نہیں کرتے۔

"ذِكْرُكُمْ" کے معنی اور بھی مفسرین نے کئے ہیں، شرفکم، عزّکم، لیکن اس کے متبادل معنی یہی ہیں کہ اس میں تمہارا تذکرہ ہے ــــ فیہ حدیثکم ــــ تو قرآن مجید میں عمل، اور جزائے عمل کا بیان، اور اللہ تعالے کا قانون مکافات پورا پورا موجود ہے، اس نے صاف صاف کہدیا ہے:۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۔ (النساء۔۱۲۳)

نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پائیگا۔

مسلمانو! نہ تم پر کچھ منحصر ہے، اور نہ اہل کتاب پر (جن کو بڑے بڑے دعوے ہیں!...... ...... ہمارا قانون بے لاگ ہے، قانون الٰہی یہ ہے کہ "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ" جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ ملے گا، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غدّاری اور بے وفائی کا، انتشار کا، اختلاف کا، بےعملی کا، دولت پرستی کا، اقتدار پرستی کا سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ ایک جزا ہے جس میں کوئی استثناء، رورعایت جنبہ داری نہیں، یہ مضمون قرآن مجید میں کہیں صراحتاً اور کہیں کنایۃً بیان کیا گیا ہے، اس میں قوموں کے، سلطنتوں کے، بڑے بڑے جباروں کے تذکرے بھی ہیں، اور کمزوروں کا ذکر بھی ہے، اس میں یہ آیت بھی موجود ہے:۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ (الاعراف۔۱۳۷)

اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو زمین (شام) کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی وارث کر دیا، اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدۂ نیک پورا ہوا اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔

اور اس طریقہ سے دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

وَنُرِيدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (القصص ـ ۵ ـ ۶)

اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں جو ملک میں کمزور کیے گئے تھے، اور انھیں سردار بنادیں، اور انھیں وارث کریں اور انھیں ملک پر قابض کریں، اور فرعون اور ہامان، اور ان کے لشکروں کو وہ چیز دکھادیں جس کا ان کو خطرہ تھا۔

اس طرح قرآن مجید قوموں، تاریخی ادوار، مختلف مراحل حیات، اور مختلف زندگیوں کے انواع واقسام کا ایک بولتا ہوا مرقّع اور چمکتا ہوا صاف وشفاف آئینہ ہے جس کا جی چاہے فرد ہو یا قوم، جماعت ہو یا انجمن، خاندان ہو یا قبیلہ، اس میں اپنی صورت دیکھ لے اور اپنی جگہ تلاش کرلے، اور اپنے متعلق خود فیصلہ کرے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہونیوالا ہے، اللہ تعالےٰ سے کسی کا رشتہ نہیں، اس نے صاف صاف کہدیا ہے :۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ (المائدہ ـ ۱۸)

اور یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہدو پھر تمہارے گناہوں کے باعث تمھیں کیوں عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی اور مخلوقات کی طرح ایک آدمی ہو۔

للکار کے فرمایا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، ہم تو بالاتر ہیں، ہم انسانیت کی سطح سے بالاتر ہیں، ہم خدا کی اولاد ہیں، خدا کے چہیتے ہیں، لاڈلے بیٹے ہیں، تو اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ پھر خدا کا قانون مجازات تم پر کس طرح

جاری اور ساری ہے، تمہاری رعایت کیوں نہیں کی جاتی؟ تم بھی ایسے ہی ایک انسان ہو، جیسے اور مخلوق۔

میرے بھائیو، بزرگو، اور دوستو!

میں آپ حضرات کے خلوص و محبت، آپ کے اکرام و اعزاز سے بہت متاثر ہوں، میں ناشکر گذار انسان نہیں بننا چاہتا، لیکن میں اس کا تقاضا یہ نہیں سمجھتا کہ میں آپ کو مطمئن کروں، اور آپ کی تعریف کر کے چلا جاؤں، جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو وہ خطرے کی نشاندہی کرتا ہے، وہ اس کے چہرے کو دیکھتا ہے، اس کی نبض دیکھتا ہے، ہر وقت اس کا منہ دیکھتا رہتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی تکلیف تو نہیں، میں آپ سے عرض کرتا ہوں، کہ آپ بہت نازک دور سے گذر رہے ہیں، میں انجمن نصرۃ الاسلام کے پلیٹ فارم سے بہتر کوئی پلیٹ فارم نہیں سمجھتا کہ آپ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کروں جو عین "نصرتِ اسلام" ہے، اس انجمن کے بانی ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ایک مرکز قائم کیا جہاں بیٹھ کر اور جس کے ذریعہ وہ اسلام کی نصرت کر سکیں، لیکن نصرت اسلام کا کام بہت وسیع ہے، اور آپ میں سے کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی مقتدر ہستی، کوئی قابل احترام بزرگ اس سے سبکدوش اور فارغ البال نہیں ہو سکتے۔

میرے بزرگو اور دوستو! حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے جب مصر فتح کیا جو اس وقت دنیا میں تمدن کی چوٹی پر تھا، اور سرسبزی و شادابی میں اس پورے علاقہ کا کشمیر تھا، حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے وہ خوبصورت ترقی یافتہ معدنی، حیوانی، انسانی، زمینی دولتوں سے بھرپور سرزمین فتح کی، ایک فاتح کو جو خوشی، جو اطمینان ہونا چاہئے تھا، وہ ان کو نہیں ہوا، اس لئے کہ انھوں نے صحبت نبویؐ پائی تھی، قرآن مجید کے تدبّر، اور صحبت نبویؐ کی برکت نے ان کی آنکھیں، بلکہ

ان کا دل و دماغ روشن کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے فراست مومن عطا فرمائی تھی، اور فراستِ ایمانی سے آگے ایک قدم فراست صحابیت عطا کی تھی، انھوں نے عرب مسلمانوں سے جو اس ملک کے فاتح اور حکمراں تھے، ایک بات کہی جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے "انتم فی رباط دائم" دیکھو یاد رکھو تمہیں یہاں کی زمین، فضا کی دل کشی و رعنائی، یہاں کی دولتیں اور تمدن اپنے میں مشغول نہ کرنے پائے، اور تم اس سرزمین میں کھو نہ جانا، تم اپنے کو پالو، اور حقیقت کو پالو، وہ کیا ہے "انتم فی رباط دائم" تم ہر وقت ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہو، تم یہ نہ سمجھنا کہ تم نے قبطیوں کو شکست دی، اور رومن ایمپائر کے بہترین علاقہ پر تمہارا قبضہ ہو گیا، جزیرۃ العرب بالکل قریب ہے، اور یہاں تم نے پورے انتظامات کر لئے ہیں، اس پر تم دھوکہ نہ کھانا "انتم فی رباط دائم" تم ایسی جگہ کھڑے ہو کہ آنکھ جھپکی اور مارے گئے، تمہیں یہاں ہر وقت بیدار رہنا چاہئے، ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے، تم ایک پیام کے علمبردار ہو، تم ایک دعوت لے کر... آئے ہو تم ایک سیرت لے کر آئے ہو، اگر دعوت سے تم نے غفلت کی تو تم مارے گئے، اور اگر تم نے اپنی سیرت کھو دی جو تم عرب سے لے کر آئے تھے، جو تم آغوش نبوت سے، اور مرکز رسالت (مدینہ) سے لے کر آئے تھے، تو تمہیں کوئی برتری حاصل نہیں ہوگی، اگر تم نے کبھی یہ سمجھا کہ تم کھانے کمانے کے لئے یہاں آئے ہو، تم یہاں کی سرزمین سے، یہاں کے حسن و جمال سے متمتع ہونے کے لئے آئے ہو، تم یہاں کے عیش و عشرت میں پڑ گئے، اور تم نے ذرا سی بھی غفلت کی، تو پھر تم پر کوئی رحم نہیں کھائے گا، تم یہاں بچ نہیں سکتے۔

آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے جو بات عرب کے ایک سپاہی نے جو کسی دانشگاہ کا تعلیم یافتہ نہیں تھا، کہی تھی، آج وہی بات صادق ہے، آج بڑے بڑے اسلامی ملکوں میں یہ بات صادق ہے کہ "انتم فی رباط دائم" آپ کی ذمہ داری ہے، اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے،

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی، لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے، یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے، ابوبکر صدیق رضؓ اس وقت خلیفۂ وقت تھے، انھوں نے کہا "اینقص الدّینُ وأنا حیٌّ" کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے، کوئی قطع و برید ہو سکتی ہے؟ حیف ہے میری زندگی پر، اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم ہونے لگے، اور اس کے فرائض و احکام میں انتخاب کیا جانے لگے کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوٰۃ نہیں، یا زکوٰۃ بھی ٹھیک روزہ نہیں، میں زندہ ہوں، اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ یہ ہو نہیں سکتا!

..... بس یہ حمیت تھی جو اُبل کر ان کی زبان پر آئی، اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے، اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ایک انسان کی حمیت اسلامی، ایک انسان کے احساس ذمہ داری نے تہ بہ تہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا، تاریخ لمبی ہے، اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں، لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی، وہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی یہ بات تھی "یہ نہیں ہو سکتا میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے" میں نے جو دین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پایا تھا، وہ دین بے کم وکاست سو فیصدی رہے گا، ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے ٹلنے نہیں دوں گا، اور انھوں نے کر کے دکھا دیا۔

حضرات! آپ علمائے کرام ہیں، آپ زعمائے قوم ہیں، آپ میں بڑے بڑے خطیب ومقرر ہیں، آپ انجمنوں کے بانی اور اس کے ستون ہیں، آپ کشمیر کا قلب و دماغ ہیں، آپ کا فیصلہ اصل میں فیصلہ کن ہوگا، پہلی بات یہ ہے کہ اس سرزمین کی اسلامیت باقی رہے یہ آپکے ذمہ واجب ہے، کل حشر کا میدان ہوگا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے

ہوں گے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ عدالت کی کرسی پر ہوگا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہاتھ ہوگا، اور آپ کا گریبان یا دامن ہوگا، آپ سے سوال ہوگا کہ اللہ نے اس سرزمین کو دولت اسلام سے مشرف کیا، اولیائے کرام کو وہاں بھیجا، وہ اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اس وادی میں پہونچے، انھوں نے خدا کا کلام اور پیغام وہاں کے باشندوں کو پہونچایا، پھر ہم نے اسلام کے پودہ کو تن آور، بار آور، اور پُرثمر درخت بنایا، وہ درخت سیکڑوں برس تک سرسبز شاداب، اور پرثمر و سایہ دار رہا، ہزاروں مسجدیں بنیں، سیکڑوں مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں، جلیل القدر علماء و محدثین و فقہاء پیدا ہوئے لیکن تمہاری ذرا سی غفلت و سُستی، یا اختلاف و انتشار، یا کوتاہ نظری و کم نگاہی سے اسلام کا یہ باغ خزاں کی نذر ہوگیا۔

میں اسپین گیا، وہاں سے دل پر یہ چوٹ لے کر آیا کہ خدا جانے وہ کیا غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ مردم خیز سرزمین، اولیاء و ائمہ کا مرکز اسلام سے محروم ہوگیا، بقول اقبالؔ آج اس کا حال یہ ہے۔ ع

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ غلطی اور غلطی کی سزا میں تناسب ہونا ضروری نہیں ہے، بعض مرتبہ چھوٹی غلطی ہوتی ہے لیکن سزا بہت بڑی ہوتی ہے، جس کے کچھ اور اسباب ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ایک چھوٹے سے فیصلہ میں غلطی ہوئی اس کا نتیجہ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے، دنیا کی بہت سی قوموں نے اور جماعتوں نے غلطی کی اور کسی خاص موقعہ پر کمزوری دکھائی، صدیوں تک اس کی سزا ملتی رہی، آپ اسپین میں اسلام کے زوال کی تاریخ اور اس کے اسباب کا سراغ لگائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عرب قبائل کی رقابت و اختلاف یعنی ربیعہ و مُضَر، عدنانی اور قحطانی، حجازی اور یمنیوں کا اختلاف اس کا بڑا سبب تھا، جن لوگوں نے اسپین کے

اسلام، اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس میں بڑا ہاتھ اس کا تھا کہ عدنانی اور حجازی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، اور قحطانی، یمنی چاہتے تھے کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، انھوں نے کبھی تبلیغ واشاعت اسلام کی طرف توجہ نہیں کی، وہ جنوب کی طرف سمٹتے چلے گئے (جہاں سے مسلمان ملک مغرب اقصےٰ مراکش قریب تھا) شمال کی طرف بڑھنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی، انھوں نے تعمیرات میں اور تمدن میں اپنی صلاحیت اور ذہانت صرف کی لیکن اسلام کے استحکام، اور اسلام کو وہاں کی آبادی کے دلوں میں اتارنے کی کوشش نہیں کی، انھوں نے مدینۃ الزہراء آباد کیا، انھوں نے الحمراء کا قلعہ بنایا، انھوں نے مسجد قرطبہ تعمیر کی جو فن معماری (ARCITECTURE) کا دنیا میں منفرد نمونہ ہے لیکن ان کو چاہیئے تھا کہ اس کے بجائے وہ اپنی گرد و پیش کی آبادی کو اسلام سے مانوس کرتے، اسلام سے متعارف کراتے، بجائے پیچھے ہٹنے کے (یعنی جبل الطارق کی طرف آنے کے) ان کو آگے بڑھنا اور یورپ میں پیش قدمی کرنی چاہیئے تھی، لیکن وہ تہذیب وتمدن کی ترقی، اور فنون لطیفہ کی سرپرستی اور تعمیرات میں لگ گئے، شعروشاعری میں منہمک ہو گئے کسی وقت غلطی بہت بڑے اور دوررس نتائج پیدا کرتی ہے، کبھی کسی قوم نے بہت بڑا ظلم کیا، اور اگر آدمی کے ہاتھ میں ترازو دے دیا جائے تو کہے کہ تختہ الٹ جائے لیکن ایسا نہیں ہوا، مگر ایک بیوہ کی آہ، ایک یتیم کی کراہ انقلاب سلطنت کا باعث بن گئی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کی اسلامیت ہر قیمت پر باقی رہے، یہ آپ کا فریضہ ہے، اور یہ آپ کے حق میں بھی بہتر ہے، عالم اسلام کے حق میں بھی بہتر ہے، ہندوستان کے حق میں بھی بہتر ہے ہندوستان کے حالات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنی خصوصیات اور اکثریت کے ساتھ باقی رہیں، ہندوستان میں جب ہی صحیح توازن قائم ہوگا، ملک اسی وقت عزت پائے گا،

اس کو استحکام حاصل ہوگا، جب یہاں پر آپ اپنی خصوصیات اپنے پیام، اپنی امن پسندی، انسان دوستی، تعمیری ذہنیت اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ باقی رہیں، جب کوئی مسئلہ سامنے آئے تو فیصلہ کن بات یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا اس خطہ کی اسلامیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہی نہیں بلکہ یہاں کی اسلامی تہذیب و معاشرت اور یہاں کے اسلامی ادارے بھی باقی رہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے، عقیدہ کی صحت، یعنی اللہ تبارک و تعالےٰ کے ساتھ موحّدانہ تعلق، اور اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکانے کا عزم، اس میں اگر کمی ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ کی نصرت میں کمی ہوتی ہے، اور قرآن مجید میں صاف صاف اشارے ہیں کہ جس امت کی توحید میں فرق آیا، اس کی طاقت میں فرق آگیا، طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ اور منبع عقیدۂ توحید ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا	اب ہم کافروں کے دلوں میں ہیبت
الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ	ڈال دیں گے، اس لئے کہ انھوں نے اللہ کا
يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ	شریک ٹھہرایا، جس کی اس نے کوئی دلیل
وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ○	نہیں اتاری، اور ان کا ٹھکانا دوزخ
(آل عمران۔ ۱۵۱)	ہے، اور ظالموں کا بہت برا ٹھکانا ہے۔

اور:۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ	بیشک جنھوں نے بچھڑے کو معبود بنایا،
غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ	انھیں ان کے رب کی طرف سے غضب
الدُّنْيَا ۚ ...... وَكَذَٰلِكَ	اور دنیا کی زندگی میں ذلت پہونچے گی...

نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ ○ ....اور ہم بہتان باندھنے والوں کو یہی سزا

(الاعراف-۱۵۲) دیتے ہیں۔

شرک ضعف کا سبب ہے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا" سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ" اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں، زہر میں ایک خاصیت ہے تریاق میں ایک خاصیت ہے، پانی میں ایک خاصیت ہے، آگ میں ایک خاصیت ہے اسی طرح شرک میں کمزوری کی خاصیت ہے، اور توحید میں طاقت اور بے خوفی، اور بے رعبی کی خاصیت ہے، اس لئے سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ عقائد کی تصحیح ہو، خدا کے ساتھ ابراہیمی محمدی قرآنی تعلیم کے مطابق توحید کا رشتہ استوار ہو، اس رشتہ کو پھر استحکام کی ضرورت ہے، اس لئے کہ شیطان ہمیشہ تاک میں رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ چھاپا مارتا رہتا ہے، اور چور وہیں جاتا ہے، جہاں دولت ہوتی ہے، آپ کے پاس توحید کی، ایمان کی دولت ہے اس لئے آپ کے لئے خطرہ ہے، ان کے لئے خطرہ میں نہیں بتاتا جن کے پاس سرے سے یہ نعمت نہیں، آپ کے پاس خدا کے فضل سے یہ نعمت ہے، آپ کو باہر سے ملی اندر سے ملی، وہ نعمت یہاں اب زمین کا جز بن گئی ہے اس ملک کا حصہ بن گئی ہے، یہاں کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے، یہاں کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے، لیکن اس سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسری جس بات سے میں ڈرتا ہوں، وہ انتشار اور افتراق ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے خاصیت ضعف کی رکھی ہے:۔

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا ..... اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو
فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ ..... اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے
وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ ..... اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو،

الصّٰبِرِينَ ٥ (الانفال - ۴۶) بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، دیکھو آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، منازعت و مخاصمت سے کام نہ لو، ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے، تمہاری بندھی ہوئی ہوا اکھڑ جائیگی، اداروں کی کثرت بے شک زندگی کی علامت ہے، اور بقدر ضرورت اس کو ہونا چاہیئے، لیکن یہ کہ ہر محلہ پر ایک ایک جھنڈا، ہر گھر پر ایک جھنڈا ہو، ہر جگہ ایک انجمن ہو، یہ صحیح نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اکثر کمزوریوں میں، اور اکثر غلطیوں کی جڑ میں جو بات ملتی ہے، وہ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے، میں کوئی حکم نہیں لگاتا، کوئی شہادت نہیں دیتا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی محبت، پیسے کی محبت بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہے، جہاں سے بھی دولت آئے جس طرح سے بھی دولت ہاتھ لگے، جس طرح سے عزت و اقتدار میسّر ہو، جس طرح سے ترقی منصب اور عہدہ ملے بہر حال وہ مطلوب ہے، اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے، اس سے مطلب نہیں کہ یہ اجتماعی مفاد کے خلاف ہے یا موافق، یہ بیماری کی ایک بڑی علامت ہے، اس سے بھی زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔

چوتھی چیز تمدن کی خرابیاں، اسراف، فضول خرچی اور روایات پرستی، اور اس میں غلو و اسراف تکبّر و تفاخر ہے، جس کو قرآن نے "ترف" اور "بطر" کے لفظ سے یاد فرمایا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِی قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا	اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں
قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ	بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ
کٰفِرُوْنَ ٥	جو چیز دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے
(سبا - ۳۴)	قائل نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا کہ :۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ	اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا
مَعِيْشَتَهَا، فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ	جو اپنی (فراخی) معیشت پر اترا رہی تھیں
مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا، وَكُنَّا نَحْنُ	سو یہ ان کے مکانات ہیں جن کو ان کے بعد
الْوٰرِثِيْنَ ○ (القصص - ۵۸)	آباد ہونے کی بہت کم نوبت آئی اور ان کے
	پیچھے ہمیں ان کے (شہر و دیار) کے مالک رہے۔

تمدن کی فضولیات کو کم کیجئے، یہ نہیں کہ جس طریقہ سے شادیوں میں ہوتا آیا ہے، جس طریقہ سے شاہانہ تجمّل اور رئیسانہ دولت کا اظہار ہوتا آیا ہے، ویسا ہی ہو اب اس کا وقت نہیں، ذرا آنکھیں کھولئے، اور وقت کو پہچانئے، اور غریب طبقہ کا خیال کیجئے جن کو یہ وسائل حاصل نہیں۔

ایک چیز یہ ہے کہ کیرکٹر میں صلابت ہونی چاہیئے، یہ نہیں کہ آدمی بالکل پارے کی طرح ہو جائے کہ اس کو کسی وقت قرار نہیں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کسی چیز میں ثبات نہیں، یہ بھی قوموں کے لئے بڑی مہلک بیماری ہے، اپنی سیرت میں صلابت اور استقامت پیدا کیجئے۔

یہ بات میں عام طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کہتا ہوں، اور صرف اہل عجم سے نہیں، عربوں سے بھی کہتا ہوں، الحمدللہ میرے مضامین اس پر شاہد ہیں، جن تقریروں میں میں نے عربوں کو مخاطب کیا ہے، ان کا مجموعہ "العرب والاسلام" کے نام سے الگ چھپ گیا ہے، اس کو دیکھا جا سکتا ہے، یہ مشترک بیماریاں ہیں مشرق کی، ایشیا کی، اور ہم مسلمانوں کی خاص طور پر۔

تو ایک چیز تو یہ کہ عقائد کی تصحیح ہونی چاہیئے، اور دوسرے یہ کہ افتراق و انتشار کو دور کرنا چاہیئے، اتحاد ہونا چاہیئے، اور تیسری بات یہ کہ حُبِّ دنیا، دولت کی محبت پر

کچھ پابندی عائد کرنی چاہیئے، حدیث شریف میں آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ معجزہ ہے، ان معجزات میں سے جو حدیث کی شکل میں اور ارشادات نبویؐ کی شکل میں محفوظ ہیں "حبُّ الدنیا رأس کل خطیئۃ" (دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے، ہر غلطی کی جڑ ہے) آپ دیکھیں گے کہ فلاں افسوسناک واقعہ کیوں ہوا؟ اس نے کیوں بے وفائی کی؟ یہ اس سے کیوں ٹوٹا؟ وہ اس سے کیوں ملا؟ اس نے ملّت فروشی کیوں کی؟ اس نے ملک فروشی کیوں کی؟ اس نے ضمیر فروشی کیوں کی؟ سب کی جڑ میں ملے گی، دنیا کی محبت اور کچھ نہیں۔

ایک اور کمزوری کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو مسلمانوں کی عام کمزوری ہے، اور کسی کسی علاقہ میں (بعض خاص اسباب کی بناء پر) زیادہ پائی جاتی ہے، وہ ضرورت سے زاید "جذباتیت" ہے، یہ کمزوری جہاں اور جب اجتماعی ... طور پر پائی جاتی ہے، اور جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے، بڑے خطرات اور نقصانات کا موجب ہوتی ہے، اور اس سے بعض غلط اندیش عناصر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، بعض نادان دوست بھی سخت نقصان پہونچا دیتے ہیں، تاریخ میں بعض بڑے ملّی حوادث و مصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال پذیری، اور سرعت انفعال تھی، کسی شاعر نے صحیح کہا ہے ؎

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

پھر اگر یہ "بے دانشی" ایک دو افراد کی طرف سے نہ ہو، بلکہ ایک بڑی جماعت یا عوام کی طرف سے ہو، تو وہ اور مہیب، رسوا کن اور دور رس نتائج کا سبب بن جاتی ہے، اسی حقیقت کو مشہور حکیم عرب شاعر متنبّی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

وجُرمٍ جرَّہٗ سفھاءُ قومٍ فحلّ بغیر جارمہ العقابُ

(وہ غلطی جس کا ارتکاب کسی قوم کے خفیف العقل لوگوں نے کیا، اس کے نتیجہ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گئے، اور ناکردہ گناہ لوگوں کو بھی اس کی سزا بھگتنی پڑی)

جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یا تاریخ میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں، یا انھوں نے دین حق کا دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم و بردبار، متحمل و عالی ظرف، اور اسی کے ساتھ بہادر و غیور واقع ہوئی تھیں، اور صدر اول کے مسلمان تو اس کا بہترین نمونہ ہیں، میں نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں کہا کہ "میں ابھی اس شہر میں داخل ہو رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ میری کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا ہے، اس کے پیچھے کی جانب جلی حروف سے لکھا ہوا ہے "HIGHLY IMPLAMEABLE" (جلد اور بہت زیادہ آگ پکڑ لینے والی چیز) میں نے کہا یہ پٹرول کی تعریف ہو سکتی ہے، بارود کی تعریف ہو سکتی ہے، کسی آتش گیر مادّہ کی تعریف ہو سکتی ہے، مسلمان کی تعریف تو نہیں ہو سکتی کہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھیں، اور عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر جو چاہیں کر گزریں، عمل و ردّ عمل میں کوئی تناسب نہ ہو، رائی کا پربت بنا دیں، اور دوست دشمن خطاوار و غیر خطاوار، کمزور و طاقتور، بچوں بوڑھوں کسی کی تمیز نہ ہو، یہ جذباتیت اور سریع الانفعالی ایک خطرناک بیماری ہے، جس کے علاج کی فوری ضرورت ہے اور ہمارے قائدین، داعیان دین، اور تعلیم و تربیت و اصلاح و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو اس کی طرف فوراً توجہ کرنا چاہیئے۔[1]

---

[1] جذباتیت سے متعلق ٹکڑے کا اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت اضافہ کیا گیا، مقرر کو احساس تھا کہ یہ ضروری بات جو اس نے دوسری مجالس میں کہی، اس آخری اور اہم خطاب میں رہ گئی تھی۔

حضرات! میں خوش ہوں کہ میرے قیام کشمیر اور میری حقیر تقریروں کا خاتمہ ایک ایسی جگہ اور ایک ایسے مرکز سے ہو رہا ہے، جہاں نصرت اسلام کے لئے ایک منظم، مخلصانہ و دانشمندانہ کوشش شروع ہوئی، خاص طور سے خدا کے ایک مخلص بندہ مولانا رسول شاہ صاحب نے نصرۃ الاسلام کی بنیاد ڈالی، اللہ تعالیٰ نے اس درخت کو قبول فرمایا، بارآور کیا، اور سایہ دار بنایا:

کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا	گویا وہ ایک پاک درخت ہے، جس کی جڑ
فِی السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۢ	مضبوط (زمین کو پکڑے ہوئے ہے) اور
بِاِذْنِ رَبِّھَا ۔	شاخیں آسمان میں ہیں، اپنے پروردگار کے
(ابراہیم -۲۴-۲۵)	حکم سے ہمیشہ پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہے

اس درخت نے پہلے بھی پھل دیا، اور اب بھی پھل دے رہا ہے، اور اگر خدا کو منظور ہے تو اللہ سے امید ہے کہ آئندہ بھی یہ پھل دیتا رہے گا، اس کو مضبوط کیجئے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی گذارش ختم کرتا ہوں، امید کرتا ہوں کہ میری یہ باتیں آپ کے دل و دماغ میں ضرور محفوظ رہیں گی، اور ان لوگوں کے ذہن میں ضرور رہیں گی، جو اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں، وہ کمزوری کے اسباب کو رفع کر کے نصرت الٰہی کو کھینچنے اور بلانے والے اسباب اور شرائط کو پورا کرنے، اور ان اسباب کو مہیا کرنے کی کوشش کریں، تاکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد ہو:۔

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۚ	اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب
وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ	نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر
مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ	کون ہے کہ تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو
الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۶۰)	چاہئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کے اس اعزاز کا، اور مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص طور پر ان کے رفقائے کار اور حاضرین کا عام طور پر دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں، اور آپ بھی دعا کریں کہ میری اس حاضری کا کوئی حصہ قبول ہو جائے، خدا کے یہاں کوئی قدم قبول ہو جائے، میرے یہاں جو سات آٹھ دن گذرے ہیں ان کی حرکات و سکنات سے اور ان کے اوقات میں سے کوئی چیز اللہ کے یہاں قبول ہو جائے، اور میرا یہاں آنا کسی درجہ میں بھی مفید ہو، اور میں اپنی اس حاضری پر خدا کے یہاں شرمندہ نہ ہوں کہ میں کس مقصد کے لئے گیا تھا، اور کیا کر کے آیا۔

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں

[وہ خطبہ جو کشمیر یونیورسٹی کے ساتویں کانووکیشن منعقدہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کئے جانے کے موقعہ پر پڑھا گیا۔]

جناب چانسلر صاحب! (بی کے نہرو گورنر کشمیر) پرو چانسلر صاحب! (شیخ محمد عبداللہ چیف منسٹر کشمیر) وائس چانسلر صاحب! (ڈاکٹر وحید الدین ملک) اساتذۂ جامعہ فضلائے کرام اور معزز حاضرین!!

میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں، اور جیسا کہ علامۂ اقبال نے کہا ہے۔ ع

دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں، اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ "وحدت" سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اس کو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب چانسلر صاحب وائس چانسلر صاحب اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اپنے ایک علمی اعزاز کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس کا انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے۔

میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے، وہی "عالم" اور "دانشور" ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحقِ خطاب ہے، نہ لائقِ سماعت، بدقسمتی سے ادب و شاعری میں بھی یہی حال ہے، جو ادب کی دکان نہ لگائے، اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے، اور ادب کی وردی پہن کر ادبی محفل میں نہ آئے، وہ "بے ادب" ہے، لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور کبھی معاف نہیں کیا، جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہ دیتی ہو، یا جن کو بدقسمتی سے وردیوں کے "گودام" سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے، اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں۔

حضرات! اس موقّر دانشگاہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو فلک بوس ہمالیہ کی ایک سرسبز وحسین وادی میں منعقد ہو رہا ہے، مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند تھا، اور نہ سرسبز[1]، تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش آیا تھا، اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں، بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس کا اس "لوح و قلم" سے خاص تعلق ہے، جس پر علم و تہذیب اور تحقیق و تصنیف کی اساس ہے، اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانشگاہیں وجود میں آتیں، اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدر و قیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے، جو ۶ اگست ۶۱۰ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

---

[1] اس موقعہ پر مقرر نے کہا کہ وہ سرزمین خشک اور وہ پہاڑ غیر سرسبز تھا، لیکن حفیظ جالندھری نے خوب کہا ہے ؎

نہ یاں پر گھانس اگتی ہے نہ یاں پر پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

مکہ کے قریب غار حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے :-

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ	(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو،
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ	جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی
الْاَكْرَمُ ٥ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ٥ عَلَّمَ	پھٹکی سے بنایا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار
الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ٥	بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم
(العلق ۔ ۱ ۔ ۵)	سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں
	جن کا اس کو علم نہ تھا۔

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط، اور بارانِ رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخر اور ملتوی نہیں فرمایا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے، غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی امّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس نبی امّی پر ایک امت امّی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانشگاہیں تو بڑی چیز ہیں، حرف شناسی بھی عام نہیں تھی) پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے، اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے تو اس کی ابتداء ہوتی ہے، "اِقْرَاْ" سے جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "پڑھو" یہ اشارہ تھا، اس طرف کہ آپ کو جو امت دی جانے والی ہے، وہ امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی، بلکہ معلّم عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے، وہ دور "امیّت" کا دور نہیں ہوگا،

وہ دورِ وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دورِ ترقی کا دور ہوگا۔

"بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" (اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا) بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستہ سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، اس کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آگاہی دی گئی کہ اس علم کی ابتداء "اسم رب" سے ہونی چاہیئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کرسکتا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز تھی جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصوّر نہیں کرسکتا تھا، اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اوّلیت دی جائیگی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس امّی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہوگی۔

یہ ایک انقلاب انگیز دعوت تھی کہ علم کا سفر خدائے حکیم و علیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہیئے، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل، بہت پُرپیچ اور بہت پرخطر ہے، یہاں دن دھاڑے قافلے لُٹتے ہیں، قدم قدم پر مہیب و عمیق گھاٹیاں ہیں، گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہیئے، اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، مجرد علم و ادب نہیں، وہ علم مقصود نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، جو محض

کھلونے سے کھیلنے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدے کی خندق کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے، بلکہ "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝" پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے، "اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی قلم کو فراموش نہیں کیا، وہ قلم جو شاید ڈھونڈھنے سے بھی مکہ کے کسی گھر میں نہ ملتا، اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل[۱] کے یا کسی "کاتب"[۲] کے جو دیار عجم سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر آیا ہو گھر میں ملتا۔

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ" انسان کو سکھایا جس کا اس کو پہلے سے علم نہ تھا، سائنس کیا ہے؟ ٹکنالوجی کیا ہے؟ انسان چاند پر جا رہا ہے، خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے، دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں، یہ سب "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ" کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟

حضرات!

اجازت دیجئے کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وادئ علم کے ایک مسافر کی حیثیت سے کچھ مشورے کچھ تجربے پیش کروں۔

---

[۱] عہد بعثت کے ایک عرب فاضل جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے، اور عبرانی زبان سے خوب واقف تھے۔ [۲] عرب میں پڑھے لکھے آدمی کو "کاتب" کہتے تھے۔

جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیرکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبالؔ ایک کفِ جَو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، کوئی اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا، ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبالؔ کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں ؎

غلام طغرل و سنجر نہیں ہیں — کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں ہیں
کسی جمشید کا ساغر نہیں ہیں — جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت، اور علم و ہدایت کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار ہوں، جن کو کسی کے لئے بھوکا رہنے میں وہ لذّت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے اور "نائے و نوش" میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں، اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے، انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لئے صرف کریں۔

دانشگاہوں کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہی ہیں؟ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہو گئی ہے، سوال یہ ہے کہ علم کے

شوق میں، جستجو کی راہ میں، علم و اخلاق کے پھیلانے، اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفّاکی و درندگی، دولت و قوت کی پرستش کو روکنے کے لئے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں، اپنی قوم کو صاحبِ شعور، مہذّب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں، جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں، جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی و تعمیری کام کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنونِ لطیفہ، حکمت و فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ ملک و ملت میں ایک نئی زندگی اور روح پیدا ہو، اور وہ سراب کی نمود اور شعلہ کی بھڑک نہ ہو، میں اس وقت ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال کے یہ شعر پڑھوں گا، جو انھوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہے تھے لیکن یہ علم و ادب فلسفہ و حکمت سب پر صادق آتے ہیں ؂

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

حضرات!

اب آخر میں مجھے اپنے ان قابلِ مبارکباد بھائیوں سے جو یہاں سے سند لے کے جا رہے ہیں، یا ان خوش نصیب عزیزوں سے جو ابھی اس چمنِ علم کی خوشہ چینی میں مصروف ہیں، کچھ کہنے کی اجازت دیجئے، میں اپنی بات کہنے میں (جو شاید کسی قدر خشک اور سنجیدہ ہو)

ایک دلچسپ کہانی کا سہارا لوں گا، جو شاید آپ کے کانوں کا ذائقہ تبدیل کرنے میں مدد کرے :-

"راوی صادق البیان کہتا ہے کہ ایک بار چند طلباء تفریح کے لئے ایک کشتی پر سوار ہوئے، طبیعت موج پر تھی، وقت سہانا تھا، ہوا نشاط انگیز اور کیف آور تھی، اور کام کچھ نہ تھا، یہ نو عمر طلباء خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے، جاہل ملّاح دلچسپی کا اچھا ذریعہ، اور فقرہ بازی، مذاق و تفریح طبع کے لئے بے حد موزوں تھا، چنانچہ ایک تیز و طرّار صاحبزادے نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چچا میاں آپ نے کون سے علوم پڑھے ہیں؟"

ملّاح نے جواب دیا "میاں میں نے کچھ پڑھا لکھا نہیں"

صاحبزادے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ارے آپ نے سائنس نہیں پڑھی؟"

ملّاح نے کہا "میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔"

دوسرے صاحبزادہ بولے "جامیٹری اور الجبرا تو آپ ضرور جانتے ہوں گے؟"

ملّاح نے کہا "حضور یہ نام میرے لئے بالکل نئے ہیں۔"

اب تیسرے صاحبزادے نے شوشہ چھوڑا "مگر آپ نے جوگرفی اور ہسٹری تو پڑھی ہی ہوگی؟" ملاح نے جواب دیا "سرکار یہ شہر کے نام ہیں یا آدمی کے؟" ملاح کے اس جواب پر لڑکے اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے اور انھوں نے قہقہہ لگایا، پھر انھوں نے پوچھا "چچا میاں تمہاری عمر کیا ہوگی؟" ملاح نے بتایا "یہی کوئی چالیس سال" لڑکوں نے کہا "آپ نے اپنی آدھی عمر برباد کی اور کچھ پڑھا لکھا نہیں"

ملاح بیچارہ خفیف ہو کر رہ گیا، اور چپ سادھ لی، قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کشتی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دریا میں طوفان آگیا، موجیں منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی تھیں، اور کشتی ہچکولے لے رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی، دریا کے سفر کا لڑکوں کا پہلا تجربہ تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اب جاہل ملاح کی باری آئی، اس نے بڑی سنجیدگی سے منہ بنا کر پوچھا "بھیّا تم نے کون کون سے علم پڑھے ہیں؟" لڑکے اس بھولے بھالے جاہل ملاح کا مقصد نہیں سمجھ سکے، اور کالج یا مدرسہ میں پڑھے ہوئے علوم کی لمبی فہرست گنانی شروع کر دی، اور جب وہ یہ بھاری بھرکم، مرعوب کن نام گنا چکے تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "ٹھیک ہے، یہ سب تو پڑھا، لیکن کیا پیراکی بھی سیکھی ہے؟ اگر خدانخواستہ کشتی الٹ جائے تو کنارے کیسے پہونچ سکو گے؟" لڑکوں میں کوئی بھی پیرنا نہیں جانتا تھا، انھوں نے بہت افسوس کے ساتھ جواب دیا "چچا جان! یہی ایک علم ہم سے رہ گیا ہے، ہم اسے نہیں سیکھ سکے۔"

لڑکوں کا جواب سن کر ملاح زور سے ہنسا اور کہا "میاں میں نے تو اپنی آدھی عمر کھوئی، مگر تم نے تو پوری عمر ڈبوئی، اس لئے کہ اس طوفان میں تمہارا پڑھا لکھا کام نہ آئیگا، آج پیراکی ہی تمہاری جان بچا سکتی ہے، اور وہ تم جانتے ہی نہیں"[1]۔

آج بھی دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں جو بظاہر دنیا کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں، صورت حال یہی ہے کہ زندگی کا سفینہ گرداب میں ہے، دریا کی موجیں

---

[1] ماخوذ از "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" از مصنف

خونخوار نہنگوں کی طرح منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہیں، ساحل دور ہے، اور خطرہ قریب، لیکن کشتی کے معزز و لائق سواریوں کو سب کچھ آتا ہے، مگر ملّاحی کا فن اور پیراکی کا علم نہیں آتا، دوسرے الفاظ میں انھوں نے سب کچھ سیکھا ہے، لیکن بھلے مانسوں، شریف، خدا شناس، اور انسانیت دوست انسانوں کی طرح زندگی گذارنے کا فن نہیں سیکھا، اقبال نے اپنے ان اشعار میں اسی نازک صورت حال اور اس عجیب و غریب "تضاد" کی تصویر کھینچی ہے، جس کا اس بیسویں صدی کا مہذب اور تعلیم یافتہ فرد، بلکہ معاشرہ کا معاشرہ شکار ہے ؂

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

شریفانہ انسانی زندگی گذارنے کا بنیادی فن، خدا ترسی، انسان دوستی، ضبط نفس کی ہمت و صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت، انسانیت کا احترام، انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت و حفاظت، اور ظالموں و طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت و وجاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدم مرعوبیت و بے خوفی، ہر موقعہ پر اور خود اپنی قوم، اپنی جماعت کے مقابلہ میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا و بینا طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جواب دہی اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گذارنے کی بنیادی شرطیں، اور ایک اچھے و خوش اسلوب معاشرہ، اور ایک طاقتور و محفوظ

وباعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں، اس کی تعلیم، اور اس کے لئے مناسب ماحول مہیا کرنا دانشگاہوں کا اولین فرض، اور اس کا حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے، اور ہم کو اس جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہیئے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانشگاہیں کتنی کامیاب، اور ان کے سند یافتہ افراد و فضلاء کتنے قابل مبارک باد ہیں، اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لئے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں، اور ہم نے کیا انتظامات سوچے ہیں۔

آخر میں میں پھر آپ کی عزت افزائی، اعتماد اور جذبۂ محبت و احترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے اپنے اس اقدام کی شکل میں اظہار فرمایا ہے۔